راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۵واں سال

Monthly
# Arxang
Lahore

ماہنامہ
# ارژنگ
لاہور

جولائی 2014

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی

# فلسطین کی تحریک آزادی میں لفظ کی طاقت بھی تلوار جیسی موثر ہے: ڈاکٹر حنان عواد

## محمود درویش اور ابوسلمان کی شاعری نے میرے ادبی اور سیاسی نظریات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا

## عالمی شہرت یافتہ فلسطینی مصنفہ کا عامر بن علی کے ساتھ مکالمہ

فلسطینی شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر حنان عواد اپنے منفرد طرز تحریر کے سبب عالمی ادب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ان کی آٹھ کتابیں شائع ہونے کے بعد کئی عالمی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ شاعری اور نثر میں یکساں مہارت رکھنے والی اس فنکارہ نے آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ سے عالمی ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لے رکھی ہے۔ فلسطین رائٹرز ایسوی ایشن کی منتخب صدر ہیں۔ انقلابی رہنما یاسر عرفات کی مشیر برائے ثقافتی امور رہ چکی ہیں اور آج کل فلسطین کے موجودہ صدر محمود عباس کی بھی کلچرل ایڈوائزر ہیں۔ اخبار میں مستقل کالم لکھتی ہیں۔ تنقید کے موضوع پر انہیں عرب دنیا میں ایک اتھارٹی سمجھا جاتا ہے اور پھر جنسی امتیاز کے متعلق ان کی تحریریں بھی عالمی سطح پر ان کا اہم تعارف ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کے پچاس سے زائد علمی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ قارئین کے لیے ان کے ساتھ پچھلے دنوں ہونے والی بات چیت پیش خدمت ہے۔

ارژنگ: شروع سے ہی بات شروع کرتے ہیں، لکھنا کب شروع کیا؟

ڈاکٹر حنان عواد: میری عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی جب یروشلم کے ایک اخبار میں میرا پہلا مضمون شائع ہوا تھا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، شاعری بھی انہی دنوں شروع کی تھی۔ شاعری یوں تو چھوٹی عمر میں ہی شروع کر دی تھی مگر ان دنوں سنجیدگی آ گئی۔

ارژنگ: یہ بتائیں لکھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا؟ یہ خیال کیسے آیا کہ لکھنا چاہیے؟

ڈاکٹر حنان عواد: میرا سارا گھرانہ بہت پڑھا لکھا تھا۔ خصوصاً میرے والد تو اچھے خاصے ادبی آدمی تھے، طبیعت میں موزونیت شاید کچھ قدرتی بھی تھی۔ مگر جس چیز نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ یہ احساس تھا کہ ہم اسرائیل کے زیر تسلط ہیں، شعور سنبھالتے ہی یہ بات بھی سمجھ آ گئی کہ فلسطین غلام ہو چکا ہے۔ ہم اپنے مادر وطن میں ہی غیر قرار دیے جا چکے ہیں۔ میرا لکھنے کی طرف مائل ہونا ایک احتجاج بھی تھا، میں نے سمجھ لیا کہ لفظ کی طاقت تلوار کی طاقت کی طرح ہے اور فلسطین کی تحریک آزادی میں لفظ کی قوت بھی تلوار جیسی موثر ہے۔ میرے خیال میں یہی بنیادی وجوہات تھیں جنہوں نے مجھے ذریعہ اظہار کے لیے تحریر کو منتخب کرنے میں ایک کردار ادا کیا تھا۔

بقیہ صفحہ نمبر 35

MONTHLY ARXANG LAHORE

# ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر ۱۶ جولائی ۲۰۱۴ء شمارہ نمبر ۷

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی مدیر: حسن عباسی

مدیران اعزازی: ڈاکٹر صغرا صدف، ابرار ندیم تن دیپ تمنا

نائب مدیر: زبیر بشیر، بدر سیماب ٭ کامران ندیم

مدیر پنجاب رنگ و انچارج شعبہ اشتہارات: نازو کاڑوی

قانونی مشیر: کامران ناشط

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

0300-4489310

Nastalique786@gmail.com

قیمت فی شمارہ 60 روپے زر سالانہ مع ڈاک خرچ 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (برائے بیرون ملک پاکستان) 5000 روپے

رابطہ 0331-4489310 0300-4489310

حمد، نعت، سلام: ۲، ۳

مضامین:

○ شرح اشعار امیر خسروؒ / غلام رسول آصف ۴

○ جاپان نامہ / امجد اسلام امجد ۷

○ عہد کا درد / محمود شام ۹

○ شیخ ایاز / پروفیسر عاشق رحیل ۱۱

○ علی یاسر...... صاحب ارادہ / اصغر عابد ۱۴

○ دردی ورد (انشائیہ) / محمد ممتاز راشد ۱۷

متفرق شاعری: ۱۸ تا ۲۴

طنز و مزاح

○ بے وفا ہیرو / عطاء الحق قاسمی ۲۵

افسانے

○ خوشبو کی تلاش / سکینہ صدف ۲۶

○ دوسرا رخ / منزہ احتشام گوندل ۲۹

○ نور پور کا کملا / احمد عدنان طارق ۳۱

○ ڈاکٹر حنان جواد کا انٹرویو / عامر بن علی ۳۵

شعری گوشے: سعید قیس، علی اکبر عباس، وحید انصاری، حسن جاوید
سیما غزل، شاہد ماکلی، ایزد عزیز، ہدایت کاشف، سلیمان عبداللہ ڈار، قمر ریاض
احمد علی کیف، محمد عدنان خالد، عمر شاہد، عقیل شافی ۳۶ تا ۴۹

ادبی خبریں، تقریبات ۵۰

تبصرہ کتب، فلیپ، آراء ۵۲

پنجاب رنگ: شاعری، نوید شہزاد، خاقان حیدر غازی، ۵۴

نامہ ہائے احباب ۵۶

ارژنگ بیرون ملک

○ امریکہ، انیلہ بھلر ○ کویت، خالد سجاد ○ اسپین، صائمہ ملک
○ بحرین، اقبال طارق ○ یوکے، سعدیہ سیٹھی ○ فرانس، اسد رضوی
○ دوحہ، قیصر مسعود ○ ناروے، ارشد شاہین ○ آسٹریلیا، ظفر اسلام
○ سعودی عرب، اسلم گمان ○ شارجہ، حفیظ عامر ○ ڈنمارک، اقبال اختر
○ دبئی، سلیمان جاذب ○ کینیڈا، طارق سیال ○ مسقط، قمر ریاض

Far East Marketing Co.
Sumeria Mansion 505 Koenji-Minami 1-45-5, Suginami-ku, Tokyo, 166-0003, Japan
E-mail: ...@hotmail.com

نے زاہد بشیر پرنٹرز ریٹی گن روڈ سے چھپوا کر اردو بازار لاہور سے شائع کیا

مشکلیں ذکر سے آساں کر دے
حمد سے درد کا درماں کر دے
اپنی رحمت میں چھپا لے مجھ کو
شورشِ دہر سے پنہاں کر دے
اس خزاں خوردہ کو سرسبز بنا
زندگی رشکِ بہاراں کر دے
دل مدینے میں مدینہ دل میں
ایسے دو قالب و یک جاں کر دے
میرے اللہ بنا کر اپنا
بے نیازِ سر و ساماں کر دے
فکر کو غلبۂ غفلت سے بچا
حاملِ شوقِ فراواں کر دے
کنجِ آسودگی روکے نہ مجھے
میرے رستے میں گلستاں کر دے

علی اکبر عباس/اسلام آباد

الٰہی اپنی مدحت کا مجھے ایسا ہنر دے دے
دکھائی دے فقط تیری خدائی وہ نظر دے دے
یہ دنیا چند روزہ ہے یہاں مانگوں تو کیا مانگوں
تری رحمت کی طالب ہوں مجھے کے میں گھر دے دے
زباں پر ذکر ہو تیرا تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
ان اشکوں میں ندامت ہو، دعاؤں میں اثر دے دے
نہیں کچھ بھی طلب اے خالقِ کون و مکاں مجھ کو
تری بخشش کے قابل ہوں سرِ محشر خبر دے دے
مرے سجدے ہوں تیرا گھر ہو، بس یہ خواب پورے کر
یہ میں نے کب کہاں مالک مجھے شمس و قمر دے دے

حجاب عباسی/کراچی

مری آنکھ جلوہ پرست ہے مجھے خوابِ شہرِ جمال دے
ترے پاس جتنے بھی چاند ہیں مرے غم کدے میں اُچھال دے
کسی چشم و لب کے طلسم کو مرے آئنوں کا اسیر کر
مجھے پھر سے دستِ ہنر بنا مجھے پھر سے اوجِ کمال دے
کبھی عمر بھر کے لیے ملے شبِ رایگاں کی مسافرت
کبھی ایک لمحہ وصال کا مری زندگی کو اُجال دے
کبھی شہرِ جاں کے طلسم کو دلِ مضطرب میں سمیٹ لے
کبھی جلوہ گاہِ نگاہ کو تب و تابِ صبحِ جمال دے
کسی طور حد سے بڑھی نہیں، شبِ غم زدہ کی صعوبتیں
اسے رتجگوں سے نڈھال کر اسے خواہشوں کا وبال دے
شبِ مضمحل تری تیرگی رگِ جاں میں پھر سے اُتر گئی
کسی تیز تر مئے ناب کا فقط ایک جامِ سفال دے

رانا غضنفر عباس/عارف والا

سوادِ شب کو جو دن کے پیکر میں ڈھالتا ہے
وہی خدا پتھروں سے چشمے نکالتا ہے
سمندروں کا سکوت بھی ہے اُسی کے دم سے
جو پانیوں کی تہوں سے موتی اُچھالتا ہے
جھلک رہا ہے سیاہ راتوں میں اُس کا پرتو
ہوا کے رُخ پر چراغ وحدت اُجالتا ہے
بڑا رحیم و کریم ہے وہ خدائے برتر
جو سر پہ آئی ہر ایک آفت کو ٹالتا ہے
وہی تو ہے جو مرا سہارا ہے زندگی میں
کبھی جو میں لڑکھڑاؤں، مجھ کو سنبھالتا ہے
اُسی کی قدرت کی ہیں گواہی حسین منظر
رضاؔ جو مٹی میں تخمِ ہستی کو پالتا ہے

علی رضا/لاہور

دے جبینوں کو سجدے، کرم اے خدا
نور سے بھر دے سینے، کرم اے خدا
نوعِ انساں خسارے میں ہے، شک نہیں
دور کر دے خسارے، کرم اے خدا
خوف کے گنبدوں میں مقید ہیں ہم
کھول دے ہم پہ رستے، کرم اے خدا
جس قدر سنگ ریزے ہیں دامان میں
کر دے اُن کو ستارے، کرم اے خدا
دے رہے تھے تمازت جو اُمید کو
بجھ گئے وہ شرارے، کرم اے خدا
بھیج بارانِ رحمت کہ تخلیق کے
ہو گئے خشک چشمے، کرم اے خدا
چھا گئے ہیں اندھیرے جو اطراف میں
کر دے اُن کو اُجالے، کرم اے خدا
ہم تمازت غضب کی نہ سہہ پائیں گے
رکھ ہمیں سائے سائے، کرم اے خدا

# حمد، نعت، سلام

جو ہے جعفر حسن نامراد ازل
رکھ اُسے اپنے دوارے، کرم اے خدا؟

جعفر حسن مبارک/فیصل آباد

## نعت

ساحل پہ مقدر کا سفینہ نہیں دیکھا
سرکارؐ! ابھی میں نے مدینہ نہیں دیکھا
بے تابیٔ دل وہ ہے کہ عشاق میں اکثر
اُس شہر میں جانے کا قرینہ نہیں دیکھا
ہر گوشہ زمیں کا ہے جہاں کانِ جواہر
خود جا کے ابھی تک وہ خزینہ نہیں دیکھا
بخشش کا تقاضا تو سدا کرتے ہو لیکن
ماتھے پہ ندامت کا پسینہ نہیں دیکھا
جس دل کو بھی اُس ذاتِ گرامی سے ہے نسبت
اُس دل میں کسی طور بھی کینہ نہیں دیکھا
ہیں کانِ نبوت میں نبی سارے ہی انمول
دنیا نے مگر ایسا نگینہ نہیں دیکھا
گو میں نے کیے لاکھ سفر دشت و جبل کے
کیا دیکھا اگر شہرِ مدینہ نہیں دیکھا
جس کرب کا حاصل ہے رضا دیدۂ بینا
دل نے ابھی وہ کربِ شبینہ نہیں دیکھا

علی رضا/لاہور

اپنا گھر بار چھوڑ کر ترے پاس
کاش رہ جائیں عمر بھر ترے پاس
تیری صحبت میں رات دن گزریں
خلد میں ہو مرا بھی گھر تیرے پاس
عمر گزری گناہوں میں اور اب
لے کر آئے ہیں چشمِ تر ترے پاس
تیری مٹھی میں سارے عالم ہیں
دیکھنے والی ہے نظر ترے پاس
اک نظر ہو کرم کی میرے حبیب
آیا ہے ایک بے ہنر ترے پاس
اس مسافر کا تو ہے رختِ سفر
اس مسافر کی رہ گزر ترے پاس

محمد ندیم بھابھہ/لاہور

## سلام و منقبت

بجناب امام زین العابدین علیہ السلام

نکلے تھے جلتے شہر سے چھوڑ کے گھر برہنہ پا
ہم نے پھر اس کے ساتھ کی عمر بسر برہنہ پا
ہاں! یہی کارزار تھا، ہاں! یہی خارزار تھا
سر بہ کف اپنے ساتھ تھا، وہ بھی مگر برہنہ پا
یاد نہیں کسی کو بھی، بھول گئے جسے سبھی
ہم ہیں اُسی شکست کے زیرِ اثر برہنہ پا
منزلِ عشق ہو گئی، شام دمشق ہو گئی
صبح سے آفتاب تھا، گرمِ سفر برہنہ پا
اہلِ الم کے ساتھ تھی، موجِ نمِ فرات بھی
آبلے چھوڑتے رہے، راستے بھر برہنہ پا
عجز کمالِ فن لیے، فکر جمالِ فن لیے
شیش محل تک آ گئے آئنہ گر، برہنہ پا
مستِ جمال سرگئیں! ڈھونڈ اُسے یہیں کہیں
دیکھا تھا وہ ابھی یہیں، خاک بہ سر، برہنہ پا
شہر بدر کیے گئے، مہبطِ زرنگار سے
خالدِ کم عیار سے برہنہ سر، برہنہ پا

خالد احمد/لاہور

منقبت امام حسینؑ

مقبول عرش پہ ہے شجاعت حسینؑ کی
کیسے تو سمجھے کیا یہ فضیلت حسینؑ کی
میں ہوں حسینؑ سے تو ہے شبیرؑ مجھ سے یوں
کر دی بیاں نبی نے فضیلت حسینؑ کی
مجھ کو تو غم نہیں مرے رہبر حسینؑ ہیں
میرے لیے ہے کافی شفاعت حسینؑ کی
حاجت نہ تھی حسینؑ کو اپنے بہشت کی
جنت کو تھی مگر جو ضرورت حسینؑ کی
ایمان ہے مرا یہ قیامت کے دن ہمیں
جنت میں لے کے جائے محبت حسینؑ کی
مدحت حسینؑ دیتی ہے تم کو جواب سکوں
عاصم ہے تم پہ سب یہ عنایت حسینؑ کی

عاصم ندیم/انگلینڈ

# شرح اشعار امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

غلام رسول آصف

شعر نمبر ۱:

نمی دانم چہ منزل بود، شب جائے کہ من بودم

بہ ہر سو رقص بسمل بود، شب جائے کہ من بودم

(میں نہیں جانتا کہ گذشتہ شب میں کس مقام پر قیام پذیر تھا، جہاں ہر طرف رقص بسمل اپنے عروج پر تھا۔) مجھے قطعی علم نہ تھا کہ میں اس کائنات کے کس کرۂ جمالیات پر قیام پذیر ہوں، جس کے روحانی حدود اربعہ کے بارے میں زمان ومکاں کی سرمدیت اور فلکیاتی اعتبار سے کہاں واقع ہے؟ مجھے بالکل شعور نہ تھا لیکن بصارت وبصیرت کو خیرہ کر دینے والی کیفیات کے احساسِ جاودانی کے تحت چشمِ قلب سے ان تمام مناظر روح پرور کا دیدار کرنا عین ممکن تھا۔ اس کرۂ روح پرور پر چاروں اطراف رقص بسمل کا جاں افروز ارتعاش غیر مختتم عبدیت اور عبودیت کے امتیازات کو برقرار رکھتے ہوئے

عبد و مولا در کمین یک دگر

ہر دو بے تاب انداز ذوق نظر

(بندہ اور مولا ایک دوسرے کی گھات میں تھے اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے خواہاں تھے۔)

کا کیف آگیں منظر پیش کر رہا تھا اور عبد ومولا کے تعلقات باہمی کی معنویت کو قرطاسِ شہود پر اُجاگر کر رہا تھا۔ بتانِ آذری اور دلبرانِ شام وایراں کے دشنہ ہائے غمزہ سے شہیدانِ جمالیات کے اس رقص کو ہر لمحہ مانند ارژنگ متحرک اور کل یوم ھو فی شان کا معروضی پیکر بنا رہا تھا جو کہ فغانی کے اس شعر کا مصداق نظر آ رہے تھے:

اے کہ می گوئی چرا جامے بجانے می خری

این سخن با ساقیٔ مہ گو کہ ارزاں کردہ است

(اے بے خبر تو یہ کیا کہہ رہا ہے کہ میں اپنی جان کے عوض اپنے محبوب ساقی کے ہاتھ سے جام کیوں لے رہا ہوں یہ بات تجھے چاہیے کہ ساقی سے کہے کیوں کہ اس نے اس جنس کو سستا کر دیا ہے۔)

During my spiritual peregrination I found myself placed at a sphere about whose spatio temporal and astronomical position I was quit ingnorant whether at perihelion or aphelion from the Sun of Divinity, yet it was spiritually inebriated one where I had been intoxicated ecstatically last night when the incessant showering of divine illuminations were entering the darkest Africa of our life and broadening the Amazininian horizons of hearts and where all around was a vast configuring of dancing martyrs targeted through the lashes, sharpened against the whetstone of aestheticism.

شعر نمبر ۲:

پری پیکر نگارے سرو قد لالہ رُخسارے

سراپا آفت دل بود، شب جائے کہ من بودم

(وہ ذاتِ بابرکات، سرو قد، مانندِ پیکرِ نور جیسی تھی، اور اُن کا چہرہ لالہ صحرائی کی مانند تھا، جو دل کے لیے قیامت ہی قیامت تھی، اُس رات جہاں پر میں تھا۔)

حضرت خسرو نے دوسرے شعر میں ان الفاظ کے تقدس کو اُجاگر کرتے ہوئے ان مرقع ہائے ندرت وجمالیات کو حضور پرانوار کی ذات بابرکات ﷺ کے ساتھ منسلک فرما کر دوسرے شعراء کو یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ ان الفاظ "پری پیکر نگارے سرو قد لالہ رُخسارے" اور "سراپا آفت دل بود" کا استعمال صرف اور صرف بقول مولانا رومی نازنین حضرت حق ہمراز رسالت مآب ﷺ کی ذات پرانوار کے لیے ہی متعین فرما دیا ہے۔ کہیں کسی اور دوسرے پر ان تراکیب کو استعمال نہیں کیا جا سکتا، اس کرہ پر موجود جو ذات پرانوار جلوہ افروز تھی۔ ان کا سراپا پری پیکر اور دراز قامت سرو فردوس کی مانند اور رُخِ انور لالہ صحرائی کی مانند درخشاں وفروزاں جہاں، سے روحانی شعاعوں کا انعکاس بہت ہی خوب تھا۔ ان تمام کیفیات کے ماحصل انسان فانی کے لیے اپنی ہستی اور حریصانہ لوازمات کو فنا کرنے کے لیے کافی تھا اور اس ذات پر قربان ہو جانے کے لیے ہر لحظہ تیار رہنا اپنے لیے باعث فخر وانبساط سمجھا جاتا ہے۔

Amongest the presences the most conspicuous, Prominent personality was like the embodiment of a fairy whose strature was like the tree of cypress and his beauteous complexion was just like a tulip all these characteristic traits were

sufficient to set the viewers to face complete annihilation of their own entities.

شعر نمبر ۳:

رقیباں گوش بر آواز، او در ناز و من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود، شب جائے کہ من بودم

(رقیب گفتگوئے عاشق و معشوق کو سننے کے لیے گوش بر آواز، بت طناز ناز آفرینیوں میں مصروف اور میں بذاتِ خود جمالیاتی امتزاج کی سحر انگیزیوں سے مسحور تھا۔ اُس وقت مجھ پر ترحم آمیز خوف طاری تھا۔ اس عالمِ بے جہات میں یہ مقام لیل و نہار، قندیلِ ادراک سے آزاد اور حرف کے لبادہ سے نا آشنا تھا۔)

اُس کرۂ لامکاں پر جب روحانی اجلاس کی کارروائیاں اپنے استغراج پر، ہر طرف تمام اقسام کی مادی تراکیب کو تجزیہی و تجریدی پرائیہ جمالیات میں تحلیل و حزین کر رہی تھیں اور اس لمحہ لالمحہ کے دورانیہ میں بت طناز کی ناز آفرینیوں کے نقوش، آغوشِ رقیب کی طرف نزول کرنے سے گریزاں اور مجتنب نظر آ رہے تھے۔ زمان و مکاں کی سرمدیت کے زاویہ معجز بردار (Critical Angle) پر مامور محافظ جو کہ فرائضِ رقوبت کی ادائیگی کے ماحول میں بھی ایک محسوس تجسس اور آرزوئے سوزاں و گدازاں، اُس سرمدی گفتگوئے بے الفاظ کے افہام و سماعت کے لیے بے تاب و بے قرار، اذن ہائے رُوحانی کو ہمہ وقت صمیمانہ انداز فکر سے آراستہ کیے، اس موقع کی تلاش میں مصروف جستجو معلوم ہو رہے تھے تا کہ اُس ماورائے الفاظ گفتگو سے محظوظ ہو سکیں، اور اُس گفتگو کی ماہیت کو جان سکیں جو "عـلـم الاسـمـاء" کی تعلیمات کے سلسلے میں ملائکہ کی شرکت کے بغیر، انسان کو تفویض کی گئی تھی اور اللہ کریم، اپنے بندے پر کیے گئے اُس اعتماد کا امتحان لے سکے جو ملائکہ کو جواب دیتے وقت "اِنّـی اَعْـلَـمُ مَـا لَا تَعْلَمُون" کے الفاظ میں پوشیدہ تھا اور رقیبانِ گوش بر آواز سے ماورائیت کے لبادہ میں ناز آفرینیوں میں مصروف "کل یوم ھو فی شأن" کی بے شمار غیر معروضی حالتوں کو شہود کے قرطاس پر منقش کرنے کے لیے اطمینانِ قلبِ انساں کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ اپنے تجسس والہانہ اور وارفتگیِ عشقِ الٰہی سے مخمور، میں اُن ناز آفرینیوں کی لطافت کے ذریعہ انبساطِ ابدی کا خواہاں ایک طرح ترحم بیز خوف میں مبتلا اور دوسری جانب رقیباں پوری طرح مستعد اور مکمل انہماک سے، اُن لطائفِ غیر کونیہ کی کیفیات کی خفیف سے خفیف آواز کو سننے کے لیے خود کو آراستہ کیے ہوئے تھے۔

اس مسابقانہ جدوجہد جو رقیبانِ گوش بر آواز اور میرے درمیان روبہ ارتقائے ہندی رواں دواں تھی۔ قربتِ الٰہی کے آداب کو بجالاتے ہوئے اپنے اپنے دائرہ ہائے کار کی ترسیم و تو سیم پر قائم، علم و عرفاں کی رقابت جہاں تحلیل ہو جاتی ہے، کے ثمرات کو حاصل کرنے کے لیے ایک دو مرکزی بیضوی مدار کے ایک مرکز پر رقیب اور دوسرے پر خسرو، آرزوؤں کے شعلہ ہائے منفرد سے آراستہ، بے قراری کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔

اس غزلیہ نعت کے تمام اشعار کا مرکزی تاثر و تفکر اس ایک شعر کے الفاظ میں جو اس کرۂ لامکاں کی کیفیات کا ایک مکمل نمائندہ ہے، مدون فرما شاعر نے ادبِ عالیہ کی ایک ایسی نظیر تخلیق فرمائی ہے جو "لَیس کَمِثلِہٖ شَیءٌ" کا اصول مصداق ہے۔ رقیبانِ گوش بر آواز کے بعد "او در ناز" اور "من ترساں" کی ترتیب و ترکیب اور تنظیم شاعرانہ میں جمال و جلال جو کہ بت طناز کی صفات غیر مترقبہ ہیں، کو شعر کے درمیان اور اس کے دونوں اطراف رقیبانِ گوش بر آواز اور من (خسرو) کو اس دو مرکزی بیضوی مدار کے متغائر مراکز پر متمکن فرما کر، بے مثال شاعرانہ فن کا مظاہرہ فرماتے ہوئے ادبِ عالیہ کی تخلیق کے جواہر کو قرطاسِ ذہن پر مترصع کر دیا ہے۔

ان دو مراکز بظاہر متبائن لیکن اُلوہی ماورائیت کی مقصدیت کے حصول کے لیے متفق اور ان کے درمیان صعودی انداز سے ناز آفریں یکتا، اس شعر کی

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
دائم رکھا ہوا ہے آئینہ نقاب میں

معنویت کو اُجاگر کر رہا تھا اور دونوں مراکز میں سے ایک پر "رقیبانِ گوش بر آواز" اور دوسرے "من ترساں" اس شعر کے آئینہ دار تھے:

تماشا کہ اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

دونوں اطراف کے قلوب، اندیشہ ہائے دور و دراز کی آفرینش میں تصریفِ مسلسل کے رقصِ بسمل کے پس منظر میں اپنی اپنی خصوصی توجیہات و توضیحات سے آراستہ اور بت طناز اپنی ان نادر ناز آفرینیوں میں مصروف کار

اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

ان دونوں مراکز کے اطراف رقصِ بسمل جاری و ساری تھا، اس میں بعض تو اپنی اس آرزو کے قتیل تھے کہ ہم اُن بسملانِ جمالیات کی صفوں میں شامل ہو جائیں جو اس آرزو کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو کر اس کرہ پر محو رقص ہیں، یہ رقص اُن حضرات پر مشتمل ہے جو سقراط، حسین بن علی، حسین بن منصور، شہاب الدین سہروردی، قرۃ العین طاہرہ اور برونو جیسی شخصیات عالم سے تسلسل حیات کو معنویت عطا فرما رہا تھا اور ناقہ ہائے بے زمام کو سوئے قطار کھینچنے کے عشق اور اس کی سرمدیت، سرشاریت اور وفوریت بے کراں کو یہ حضرات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے رقص کناں

تھے۔ یہ نخبگانِ حیات

ATHANASIUS CONTRA MUNDUM

Anthanasius against the world, one resolute man facing the whole world.

کے پیکر تھے۔

اسی امتزاجِ غیر اعلانیہ نے جو دیدارِ ایزدی کے دوران میں، جلوے کو بھی حجاب میں تبدیل کر رہا تھا، دونوں اطراف بے قراری اور اضطراری کیفیات کو ہندی ارتقاء سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ ایک طرف شنیدگی کے لیے بے تاب رقیبان گوش برآواز اس شعر کے طرز

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

کا نشانہ بنے ہوئے اور دوسری جانب خسرو کی اضطراری کیفیت بردار تمنائے ترسندہ اپنے عروج پر، جلوۂ فگن تھی۔ اس حالت کیف کی ہمہ وقت ارتقاء پذیری، لبوں پر مہر خاموشی ثبت کیے جا رہی تھی اور یارائے سخن آرائی ناممکنات کی حدوں کو چھو رہا تھا، اسی کیفیت ہوش رُبا کو بیان کرنے کے لیے، جناب حضرت بلھے نے فرمایا:

انہد واجا شاہانہ وجے

اور جناب سید وارث شاہ ؒ نے فرمایا:

"انہد دا آن کے ساز وجے، ہو جائے ایہہ جسم فنا ناتھا"

روحانی سفرنامے، جو قدیم زمانوں سے، انسان نے ہبوط سے لے کر آج تک، اپنے اپنے فہم و ادراک، وجدان اور تجسس بے کراں اور والہانہ جذبہ ملاقات ایزدی کے تحت، اپنے اُس وقت کے لسانیاتی پرایہ جمالیات سے آراستہ ہو کر تحریر کیے ہیں۔ ان سفرناموں کے دائمی نقوش اب تک وہی تاثرات اپنی آغوشِ ادب میں لیے ہوئے ہیں، ان خالقینِ ادب و ثقافت کی تحاریر ارزشیں میں، زمان و مکاں کے حوالہ جات سے، مقامات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ تاثر جو کہ اس غزلیہ نعت میں موجود تھا، جو کہ اس غزلیہ نعت میں موجود تھا۔ رُوح و قلب کو بیک وقت سیراب کر رہا ہے، جس کا تقاضا حتمی طور فقط جاذبیتِ ماورائی کی غذائیت کا حصول ہے اور دونوں کی ماہیت کے لوازمات کی ترسیل و تجذیب، وتوقیر و ناموس اور بقا و ارتقاء کا باعث ہے اور ان کو انبساطِ الوہی سے نوازتا ہے۔ مقابلتاً اگر ان ادیبانِ متجسس اور طورانِ روحانیت کے تمام روحانی سفروں کی تذہیب کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ان میں مقامات کی معروضیات کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس، حضرتِ امیر خسرو کی اس تخلیق میں "نمی دانم چہ منزل بود" اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ ان کے اِس روحانی سفر میں نہ صرف تعینِ منزل معدوم ہے بلکہ احساسِ زمان کا بھی فقدان ہے۔ آج کا فلسفہ طبیعات بھی اِس حقیقت کی طرف پیش قدمی کر چکا ہے کہ Time-Spacelessness کے نظریہ پر عمل کیا جائے۔ اس حقیقت کی طرف برگساں اور آئن سٹائن کی تصانیف اشارہ کناں نظر آتی ہیں۔ ہماری سرزمین پنجاب کے ایک مشہور صوفی حضرت بلھے شاہ نے فیصلہ کن سخن آرائی فرمائی ہے:

"گھڑیال دیو نکال
گھڑی گھڑی گھڑیال وجاوے
رین وصل کی پیا گھٹاوے"

اور یہ وہی نقاہت وحی ہے جو پہاڑوں پر اُتاری جاتی تو ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ اسی ثقالت کی تعریف فرماتے ہوئے حضرت جناب سید وارث شاہ ؒ نے فرمایا:

اساں جٹ ہاں ناڑیاں کرن والے،
اساں کچ کڑے نہ پرووٗنے نی
ہتھ گھتنا گھنڈیاں بھاریاں نوں پچھوں
نیوں کے لک نہ ٹوہونے نی
لکھاں وچوں کوئی چاوندا ای بھاری جوگ
دی ایڈر قم میاں

شعر نمبر ۳:

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود، شب جائے کہ من بودم

(اس محفل کی صدارت، خداوند کریم فرما رہے تھے اور محفل لامکاں پر منعقد تھی اور اس محفل کی شمع نورانی جناب رسالت مآب ﷺ تھے، جہاں پر اس شب میں حاضر تھا۔)

اس لامکاں کرہ پر جو اجتماع منعقد تھا وہ صرف نخبگانِ ادب روح پر مشتمل تھا اور اس اجلاسِ روحانی کی کارروائی اور صدارت کا قلم دان خداوند کریم کے دستِ متکبر جمال و جلال کی گرفت لازوال میں تھا اور اس اجلاس کی تنویرات کا مرکز و محیط حضور اکرم حضرت مآب محمد ﷺ کی ذاتِ غیر مترقبہ تھی۔

The planet where all those proceeding were being conducted was spaceless situation where God Almighty was ruling the whole assembly and the illuminating source for providing the spiritual erudition was the sacred personality of Muhammad (SAW).

# جاپان نامہ اور آج کا جاپان

امجد اسلام امجد

جاپان کی تین بڑی یونیورسٹی میں اُردو کی تعلیم وتدریس کے لیے باقاعدہ شعبے قائم ہیں۔ یہ ایک ایسا بیان ہے جو مبنی برحقیقت ہونے کے باوجود عموماً شک وشبے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے بظاہر اس کا کوئی منطقی جواز سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک میں اُردو زبان بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے جن میں سے 98 کا تعلق پاکستان اور بھارت سے ہے جو یا تو ملازمت اور تعلیم کے سلسلے میں یہاں مقیم ہیں یا انہوں نے جاپانی خواتین سے شادی کر کے جاپانی شہریت حاصل کر رکھی ہے۔ اس دوسری قسم کے متعلق زیادہ تر لوگ استعمال شدہ اور ری کنڈیشنڈ گاڑیوں کے کاروبار سے متعلق ہیں۔ چند برس قبل جب مجھے جاپان کے ایک مختصر دورے کا موقع ملا تو اس وقت وہاں پاکستانیوں کی کل تعداد تقریباً 8 ہزار تھی۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو واقعی یہ بات قرین قیاس نہیں لگتی کہ اُردو زبان یہاں کی تین یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہوگی۔ تحقیق پر پتہ چلا کہ اس کی وجہ اصل میں جاپانی صنعت کاروں کی دوراندیشی ہے کہ انہیں اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے تقریباً چالیس کروڑ اُردو بولنے اور سمجھنے والوں سے واسطہ پڑتا ہے اور چونکہ وہ بوجوہ انگریزی زبان پر بھی زیادہ دسترس نہیں رکھتے اس لیے وہ اپنے شہریوں کو براہ راست اُردو سیکھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں تاکہ آگے چل کر یہی فارغ التحصیل طلبہ ان کے لیے مترجم وغیرہ کا کام انجام دے سکیں اور یوں غالباً پاکستان اور بھارت کے علاوہ صرف امریکہ ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں جاپان سے زیادہ اُردو کی تدریس سے متعلق یونیورسٹی کی سطح کے شعبے موجود ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ جاپان کے بارے میں اُردو میں نسبتاً بہت کم مضامین اور سفرنامے لکھے گئے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ جاپان کے عوام، اہم مقامات اور طرزِ معاشرت کے بارے میں برصغیر کے لوگ بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔

حال ہی میں ''جاپان نامہ'' (عرفان صدیقی) اور ''آج کا جاپان (عامر بن علی) کے عنوان سے دو اخباری کالموں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کی وجہ سے جاپان کے لوگوں کی زندگی، رسم و رواج، سیاست، معیشت اور معاشرت کے بارے میں ہماری معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور ہم جاپانیوں کے برصغیر بالخصوص پاکستان سے تعلقات کے بارے میں بہت نئی اور اہم باتوں سے آگاہ ہوئے ہیں۔ اتفاق سے دونوں کتابوں کے مصنفین سے نہ صرف میری جاپان میں ملاقات رہی بلکہ عامر بن علی تو میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہے۔ وہ جب بھی پاکستان آئے (جو کہ اکثر آتا رہتا ہے) مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتا۔ البتہ عرفان صدیقی سے پہلے بالمشافہ ملاقات برادرم محمود شام کے توسط سے ٹوکیو میں ہی ہوئی۔ جہاں سے وہ ہر ہفتے ایک ایسے ہفت روزہ رسالے کے لیے تسلسل سے کالم بھیجتا ہے جس کا تعلق اسی اشاعتی ادارے سے ہے جس کے ساتھ محمود شام کئی برس تک متعلق رہے ہیں۔ دونوں لکھاری عمر کے اعتبار سے نوجوان نسل کے نمائندہ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی تحریر میں خاصی پختگی پائی جاتی ہے۔ دونوں ہی ادب کے ساتھ ساتھ جاپان کی تاریخ اور تہذیب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ دونوں کی نثر اچھی، ہموار اور دلچسپ ہے اور دونوں موضوعات کے تنوع پر یقین اور دسترس رکھتے ہیں۔ البتہ عامر بن علی کی تحریر میں حسِ مزاح کا استعمال ایک اضافی خوبی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتابیں جاپان اور جاپانیوں کے بارے میں ہمارے علم اور معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں اور ان کے عوام کے بارے میں بھی بعض ایسے دلچسپ حقائق کو سامنے لاتی ہیں جن سے مطالعے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ عرفان صدیقی کے چند کالموں کے عنوانات

کچھ اس طرح سے ہیں:

(۱) بیرونِ ملک نئے پاسپورٹ وامیگریشن دفاتر کا قیام، حکومت پاکستان کا قابل تحسین اقدام

(۲) بیوروکریسی کی روایتی کاہلی۔ پاکستانی آم اس سال بھی جاپان برآمد نہیں ہو سکیں گے۔

(۳) مسئلہ کشمیر، جاپان اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

(۴) بیرونی سرمایہ کاری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

(۵) جن سے دنیا مانگتی ہے وہ جاپان سے مانگتے ہیں۔

(۶) پاکستان میں اقتصادی ترقی کے لیے جاپان سے تجارت میں اضافہ ضروری ہے۔

(۷) عالمی شہرت یافتہ پاکستانی باکسر جاپان میں بھوک ہڑتال کرے گا۔

(۸) پاکستانی تارکین وطن میں جاپانی خواتین سے شادی کا بڑھتا ہوا رجحان۔

ان عنوانات سے یقیناً آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عرفان صدیقی زیادہ تر ایسے مسائل پر قلم اُٹھاتے ہیں جن کی نوعیت سنجیدہ اور تعمیری ہے۔ ایک مختصر اقتباس دیکھیے:

''جاپان میں پاکستانی مرد شہریوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق دس ہزار کے لگ بھگ ہے جن میں سے 70% نے جاپانی خواتین سے شادیاں کر رکھی ہیں اور ان سے اب ایک نئی نسل وجود میں آ رہی ہے۔ یہ نئی نسل پاکستان کو اپنا ددھیال اور جاپان کو اپنا ننھیال سمجھتی ہے اور اُمید ہے کہ یہ نسل آئندہ چند برسوں میں دونوں ملکوں کے تعلقات میں اضافے اور اپنے دین اسلام کی جاپان میں اشاعت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔''

عرفان صدیقی کے مقابلے میں عامر بن علی کے کالم نسبتاً مختصر ہیں مگر ان میں موجود موضوعات کی وسعت اور تحریر کے ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز نے کہیں کہیں انہیں مزاحیہ تحریروں سے قریب تر کر دیا ہے اس کے ابتدائی حصے کو ''چڑھتے سورج کی سرزمین کا سفر'' کا نام دیا گیا۔ چند عنوانات دیکھیے:

(۱) خزاں کی دستک (۲) چیری بلاسم

(۳) برفانی بندر (۴) علامہ اقبالؔ اور جاپان

(۵) جگنو کہاں گئے؟ (۶) پاکستانی ادیبوں کا دورہ جاپان (۷) نصرت فتح علی خان کے انمٹ نقوش

(۸) آئن سٹائن اور ڈاکٹر عبدالقدر خان

(۹) دوہری شہریت، دوسرا رُخ

(۱۰) ایٹمی بمباری کے 64 سال

اسے مشتے از خروارے کے طور پر ایک ایسے کالم سے کچھ مختصر اقتباسات جس کا تعلق پاکستانی ادیبوں کے اس دورہ جاپان سے ہے جس میں میں خود بھی شامل تھا۔ ''یہ کسی پاکستانی ادبی وفد کا اپنی طرز کا پہلا دورہ تھا اس وفد کی آمد سے قبل ابن انشا اور حکیم محمد سعید جیسے نامور لوگ اور لکھاری جاپان آئے ضرور اور اپنے سفر کا احوال بھی لکھتے رہے۔ مگر سب فرداً فرداً نیز کسی کا بھی جاپان میں مقیم پاکستانی کمیونٹی سے مکالمہ نہیں ہوا تھا۔ مقامی دانشوروں ہیروجی کتاؤ کا اور نی شی مورا شوبے نے بھی اظہار خیال کیا۔ شوبے نے اپنی تقریر میں کہا کہ انہیں پاکستان کا مشترکہ خاندانی نظام بہت پسند ہے جس میں سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ جاپان کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ امریکہ اور مغرب کی پیروی کرنے کے بجائے پاکستان سے اچھی چیزیں سیکھیں اور دوسرے مشرقی ممالک سے بھی۔ یاد رہے کہ ان اساتذہ اور طلبہ نے اظہار خیال اُردو زبان میں کیا تھا نا کہ جاپانی زبان میں۔

......اوساکا یونیورسٹی کا پروگرام اُردو ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ماتسومورا کے ساتھ سویما نے ترتیب دیا تھا۔ اس پروگرام میں طلبہ کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی اور سب نے پاکستانی لباس شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ ایک طالب علم ناکامورا تے نے طبلہ سرائی کی''

عرفان صدیقی اور عامر بن علی دونوں کئی برسوں سے جاپان میں نہ صرف مقیم ہیں بلکہ جاپانی زبان اور تہذیب سے بھی گہری واقفیت رکھتے جس کی وجہ سے ان کے کالموں کے یہ مجموعے ایک ریفرنس کی چیز بن گئے ہیں اور بلاشبہ ان جیسے لکھاریوں کے ذریعے دونوں ملکوں کے عوام اور ادیب ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ اور جان سکتے ہیں۔

❀❀❀

# عہد کا درد

محمود شام

علم کسی کی جاگیر نہیں۔ دانش پر کسی کا اجارہ نہیں۔ اسی طرح اچھا شعر بھی کسی کی میراث نہیں۔ ہم جیسے بڑے شہروں میں رہنے والے، بڑے اخبارات میں لکھنے والے اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم ہی بڑے دانشور ہیں۔ بڑے شاعر ہیں اور یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ہمارا سفر بھی چھوٹے شہروں سے ہوا تھا۔

کس ضرورت کو دباؤں کسے پورا کرلوں
اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے

واہ! واہ...... کتنا جامع تبصرہ ہے۔ آج کی معیشت پر، متوسط طبقے کی حقیقی صورتِ حال کی کیسی بے ساختہ عکاسی ہے۔ بڑی شاعری کے دعویداروں کے ہاں مجھے کسی شعر میں یہ کیفیت نظر نہیں آئی۔ حالانکہ ہم سب کو ہی اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ بار بار جیب میں ہاتھ جاتا ہے۔ بعض احباب تو جیب کے اندر ہی نوٹ گننے کی مہارت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

نصرت صدیقی درد سے بھرا دل رکھتے ہیں۔ ایک بار ملاقات ہوئی وہ کراچی تشریف لائے تھے۔ مجھے یاد ہے ان کی گفتگو میں ایک ایک لفظ میں انسانیت کا گہرا دکھ مہک رہا تھا۔ ایسے حساس ذہن والے ہی وہ غزلیں تخلیق کرتے ہیں جو سیدھی دلوں میں اُتر جاتی ہیں۔ وہ معاشرے کی تلخیاں مخاطب تک پہنچاتے ہیں لیکن بہت ہی رکھ رکھاؤ کے ساتھ بہت دھیمے لہجے میں ٹی وی چینلز کے اینکر پرسنز یا سیاسی لیڈروں کی طرح چیختے چنگھاڑتے نہیں ہیں۔

لائے گئے نہ پھر بھی کسی انتخاب میں
ہم آدمی ضرور تھے پہلی قطار کے

دیکھیے! کس سلیقے سے بات آپ تک پہنچاتے ہیں۔ پورا ابلاغ بھی ہو جاتا ہے۔ آپ پر کوئی دباؤ بھی نہیں پڑتا۔

میں تو مجبور ہوں اس کو بھی بڑا کہنے پر
جس نے میرے قد و قامت کو گھٹا رکھا ہے

نادارئ عالم کا گلہ ہے لیکن ہنگامہ برپا نہیں کرتے۔ اردگرد شکست و ریخت کا سماں بھی پیدا نہیں کرتے۔ الفاظ بہت سادہ، برمحل اور انتہائی موزوں:

ہم روایت کو نہیں ہاتھ سے جانے دیتے
ہم نے اس دور میں بھی پاس انا رکھا ہے

زور ''اس دور میں بھی'' پر ہے...... اس دور کے بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن سب کچھ کہہ دیا ہے۔ ''بھی'' کا معمولی سا لفظ۔ اس دور کے فریب، ستم، منافقت، سازشوں کو آپ کے ذہن میں لے آتا ہے۔ یہی ایک شاعر کی زبان پر گرفت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس ''بھی'' پر بہت سے مضامین، کالم اور اداریے قربان کیے جا سکتے ہیں۔ لفظوں سے کھیلنا ہی رنگ تغزل ہے لیکن اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آپ کو صرف لفظ ہی نہیں معانی کا ادراک بھی ہونا چاہیے۔

زمانے بعد تو آیا ہے لمحہ بھر تو ٹھہر
کہ آتے آتے یہ لمحہ زمانے لگتے ہیں

اس غزل کا یہ شعر:

اسیر کتنے ہی عمدہ خیال ہیں ان میں
یہ حرف و لفظ مجھے قید خانے لگتے ہیں

غزل کو زندہ رکھنے کے لیے اسے اپنے عہد کے رنگوں سے نقش کیا جاتا ہے۔ صرف حسن و عشق، ہجر و وصال ہی نہیں آس پاس جو سائے منڈلا رہے ہیں، جو زخم ہرے ہو رہے ہیں، جو خاکے ادھورے رہ گئے ہیں ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ غمِ جاناں بھی ضروری ہے اور غمِ دوراں بھی۔

جنھوں نے قومی تشخص کو پائمال کیا
معاشرے کو وہ اُونچے گھرانے لگتے ہیں

کتنی بڑی بات، کیسا کھرا سچ، کتنی سادگی سے بیان کر دیا ہے۔ اُونچے گھروں کی دیواریں ضرور لرز رہی ہوں گی۔ کڑوی سچائیاں ان کے اشعار میں بڑی خوبصورتی سے اپنی جگہ بناتی ہیں۔ پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاعر نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔ ستم زدوں کی آنکھوں میں جھانکا ہے۔ ان کے کرب کو اپنے دل میں اُتارا ہے۔ ان کے دکھ درد کو اپنا درد خیال کیا ہے۔

حد سے بڑھی جو بھوک تو مجبور والدین
اولاد بیچنے پہ بھی تیار ہو گئے

میں نقاد ہوں نہ ماہر لسانیات اور نہ ہی استاد، اس لیے کسی اصطلاح کا سہارا لے رہا ہوں نہ کسی مکتب فکر کا حوالہ...... نہ ہی نصرت صدیقی کو لبرل، روشن خیال، ترقی پسند، رجعت پسند، روایت پرست یا کسی اور خانے

میں مقید نہیں کروں گا۔ان کے اشعار میں بے ساختگی، لہجے میں یقین اور زبان میں روانی ہے۔ کہیں کسی تردد...... اور اہتمامِ خاص کا شائبہ نہیں ہوتا۔

پھر بھی نہ ترجمانیٔ جمہور ہو سکی
شائع اگرچہ سینکڑوں اخبار ہو گئے

میڈیا سے طویل وابستگی کے باوصف میں اس خیال کی گہرائی جان سکتا ہوں۔میڈیا کی آزادی، عوام کے کسی کام نہیں آسکی۔ مالکان کے وارے نیارے ہو گئے اور چند اینکر پرسنز نہال ہو گئے۔ میڈیا کارکنوں کی اکثریت اور بے چارے نادار، بے کس، پامال لوگ تو اسی طرح مسائل کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ پھیلتے شہروں اور اُجڑتے دیہات ہمارا قومی المیہ ہیں۔ زمین سمٹ رہی ہے۔اس کی آہیں سسکیاں شہر والوں کو شور میں سنائی نہیں دیتی ہیں لیکن زمین جب انتقام لینے پر آتی ہے تو شہر کے شہر مٹا ڈالتی ہے۔نصرت صدیقی نے آج کی ایک سماجی، عمرانی اور مدنی حقیقت کو بہت ہی موثر اور دل گیر انداز میں بیان کیا ہے:

ایسے پھیلے ہیں اب کے شہروں کے دائرے
گاؤں سمٹ کے نقطۂ پرکار ہو گئے

یہی المیہ ایک اور غزل میں یوں اظہار پاتا ہے:

ان مکانوں کی جگہ تھیں لہلہاتی کھیتیاں
شہر کی وسعت پسندی گاؤں کتنے کھا گئی

ہمارے ہاں ان ارضی حقیقتوں، اقدار کی پامالی پر بہت کم لکھا جاتا ہے، مغرب میں تو ان المیوں نے بڑی اعلیٰ شاعری اور معیاری ادب کو جنم دیا ہے۔ منفرد، اچھوتے خیالات، مختلف زاویۂ نگاہ رکھنے والوں کے ذہن میں ہی اُترتے ہیں۔

محرومیوں نے دل کی تمنائیں چھین لیں
بچوں نے کرنے چھوڑ دیے ہیں مطالبات

زندگی کی ایک اور حسین سچائی دیکھئے نصرت صدیقی کے ہاں کس طرح بیان ہوتی ہیں۔

مجھے اب احتیاطاً خط نہ لکھنا
مرے بیٹے کو پڑھنا آ گیا ہے

بہت خوب نصرت صاحب، غزل یہی ہے۔ غزل میں آج سے عہد کا غم بہت ہی سیدھے اور سادہ انداز میں:

بنا رہے ہو عبث کھیل کود کے میدان
ہمارے شہر کے بچے تو کام کرتے ہیں

..........

وہ کون ہیں جو انھیں کھیلنے نہیں دیتا
یہ کم سنی میں جو روزی کمانے لگتے ہیں

یہ چائلڈ لیبر اور اسی حوالے سے مغرب کی طرف سے کی جانے والی کوششوں پر ایک کھلا تبصرہ ہے کہ وہ ہمارے ماحول، مجبوریوں کا مداوا کیے بغیر اپنی تہذیب اور تمدن کو ہم پر مسلط کرنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

نصرت صدیقی کا یہ مجموعہ یقیناً اُردو شاعری میں ایک حسین اضافہ ہوگا۔ان کی زبان بہت آسان، درد بہت گہرا، رنگ تغزل بہت شوخ، لہجہ بہت نرم اور بات کرنے کی ادا بالکل الگ ہے۔ میں اپنی بات ان کے اس لازوال شعر پر ختم کروں گا۔

زمانہ ہو گیا تجھ سے جدا ہوئے پھر بھی
بدن میں ذائقہ اب بھی ترے وصال کا ہے

آپ بھی اپنے ذہن میں اس شعر کی لذت ایک عرصے تک محسوس کرتے رہیں گے۔


اے نگہ یار! یہ اعجاز کرم ہے تیرا
قطرۂ اشک سمندر ہے ترے ہونے سے

نامور سفرنامہ نگار، کالم نویس اور شاعر
ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کا پہلا شعری مجموعہ

"ترے ہونے سے"

طباعت کے آخری مراحل میں ہے

ناشر: نستعلیق مطبوعات
F-3 الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
042-4351963



ممتاز کالم نویس، سفرنامہ نگار اور شاعر
ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کے
سفرناموں کا مجموعہ

پانیوں کے دیس میں

جلد شائع ہو رہا ہے

ناشر: نستعلیق مطبوعات
F-3 الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
042-4351963

# شیخ ایاز

پروفیسر عاشق رحیل

شیخ ایاز نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بارے میں لکھا تھا:

''وہ حسن کا پیغمبر تھا۔ وہ محبت کا پیامبر تھا۔ وہ رسوم و قیود سے آزاد تھا۔ وہ رشتہ و پیوند سے بے نیاز تھا۔ یہی اُس کا نشانِ عظمت ہے۔ یہی اُس کی شانِ یکتائی کہ وہ انسانِ اوّل تھا اور انسانِ آخر۔''

ان کے یہی الفاظ خود اُن کی زندگی اور فن شاعری پر صادق آتے ہیں۔ وہ اوّل و آخر ایک انسان تھے۔ محبت بھرا دل رکھنے والے انسان۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی طرح ان کا رشتہ بھی شاعری سے ان کے آخری سانس تک رہا۔ وہ اپنی عمر کے آخری دنوں تک لکھتے رہے اور اپنے پیچھے بہت سا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام چھوڑ گئے۔

شیخ ایاز نے سندھ کے تاریخی شہر شکارپور میں بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں جنم لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طبیعت میں شاعرانہ خوبیاں پیدا کر کے ہی اس دنیا میں بھیجا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بچپن ہی سے فنِ شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ انہوں نے صرف شاعری میں ہی نہیں بلکہ نثر میں بھی اپنی فنکارانہ طبیعت کی جولانیاں دکھائیں۔ وہ عہد شناس بھی تھے اور عہد ساز بھی۔

شاعری میں اُن کی شہرت کا سبب اُن کے زبان و بیان کی صرف عمدگی ہی نہیں بلکہ اُن کے موضوعات کا تنوع بھی ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں لکھنے کا تجربہ کیا۔ دوہڑا، دوہا، بیت، کافی اور وائی جیسی قدیم اصنافِ سخن کو زندہ کیا جو سچل سرمست اور شاہ لطیف کے بعد پس پشت ڈال دی گئی تھیں۔ اب سندھ کا تقریباً ہر شاعر شیخ ایاز کی تقلید کرنے میں فخر سمجھتا ہے۔ غزل اور نظم کے علاوہ بعض ایسی اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی جو سندھی شاعروں کے لیے نامانوس تھے۔ جیسے سانیٹ، ہائیکو اور نثری نظم وغیرہ۔ ادب کی ہر صنف اُن کی دسترس میں تھی اور فن کی جس شکل کو بھی انہوں نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا اُسے نئی معنویت اور حد درجے کی فصاحت سے روشناس کرایا۔

شیخ ایاز کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے دنیا کی بہت سی بڑی زبانوں کے تمام اہم شاعروں کو پڑھا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض کو انہوں نے اصلی زبان میں پڑھا تھا جیسے فارسی، اُردو اور انگریزی کی شاعری۔ سنسکرت، ہندی، بنگالی، یونانی، لاطینی، روسی، جرمن، فرانسیسی اور ہسپانوی ادب کو انہوں نے ترجمے کے ذریعے پڑھا تھا۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آج کل امن، دوستی اور بھائی چارے کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن اسی دوستی کے بارے میں لکھے ان کے گیتوں کی وجہ سے انہیں دو مرتبہ قید و بند کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں لیکن قید و بند کی صعوبتیں بھی انہیں حق و صداقت کے راستے پر چلنے سے نہ روک سکیں۔

انہوں نے ادیب، شاعر اور دانشور کے طور پر جو راستہ اپنے لیے منتخب کیا تھا وہ آخری دم تک اُس پر چلتے رہے۔ اُس دور کے آمروں نے انہیں خاموش کرنے کی کوشش کی۔ اپنی ایک مشہور نظم میں انہوں نے لکھا تھا:

مجھے خاموش کر کے کیا حاصل کر لو گے؟
تمہارے خلاف سرکشی کے لیے ہزاروں منصور اور بھی ہیں

سوبھو گیان چندانی اپنے ایک مضمون جس کا عنوان ہے ''شیخ ایاز کی موت پر دو آنسوؤں کا نذرانہ'' میں لکھتے ہیں ''ایاز سے کسی کے کتنے ہی اختلاف رہے ہوں لیکن یہ ماننا ہی پڑے گا کہ شاہ لطیف کے بعد وہ سندھ کا عظیم ترین شاعر تھا۔ اُس کی کثیر رخی زندگی میں بہت سے لوگ تضادات بھی تلاش کر لیں گے لیکن اُس نے جو کچھ لکھا اور کیا وہ انتہائی ایمانداری اور دل کی گہرائیوں سے کیا۔ میں وقتی طور پر اس کے ساتھ اختلاف رکھتے ہوئے بھی اس کے ساتھ برادرانہ رشتے میں بندھا رہا ہوں۔ سندھ کے دوسرے ادیب اور شاعر بھی اپنے اختلافات اور انا کو بھول کر ایاز کی عظمت کا اقرار کریں۔ یہ آدھی صدی ایاز کی دھنوں سے گونج رہی ہے۔ اُس نے سندھ کے ہزاروں چھوٹے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو جگایا اور

اُبھارا ہے۔ ہم ایک لمبے عرصے تک کوئی دوسرا ایاز پیدا نہیں کرسکیں گے۔ اُس نے تاریخ ساز شاعر، ادیب اور انقلابی کا کردار ادا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں عالمی سطح کی سوچ ملتی ہے۔ اُن میں فن اور فکر کا سنگم ہے۔ وہ نہ صرف الفاظ کی جادوگری سے واقف تھے بلکہ اُس جادو کو جگانا بھی جانتے تھے۔ اس لیے اُن کے الفاظ کا استعمال کسی جوہری کی مینا کاری معلوم ہوتا ہے۔

شیخ ایاز پچاس سے زائد کتابوں اور شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ شاید ہی دنیا کے کسی شاعر نے اتنی دنیاوی مصروفیات ہونے کے باوجود اتنی تیزی سے لکھا ہوگا۔ اُن کے شعور اور تحت الشعور میں وہ مشاہدات اور تجربات تھے جو صرف اُن کے اپنے تھے۔ جو اُن کو اپنے دیس کی دھرتی سے حاصل ہوئے تھے۔ ان کا کہنا ہے ''میرے پاس آیات نہیں اشعار ہیں۔ اشعار جن کا ظہور اس کائنات کی طرح پراسرار رہا لیکن پھر بھی یہ اس دھرتی سے منسلک ہیں۔ اس کے دکھ سکھ کی بازگشت اپنی روحانیت کے باوجود مادی ہیں۔ اس دھرتی کی مٹی ہیں اور اسی کی طرح امر ہیں......''

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم اپنے ہی ملک کے دوسرے صوبوں میں لکھنے والے اہل قلم کی تخلیقات تو رہیں ایک طرف ہم ان کے ناموں سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ چنانچہ اپنے وطن، ادیبوں اور شاعروں کو جاننے کے لیے نہ صرف ایسی تقریبات کا انعقاد ضروری ہے بلکہ لکھنے والوں کے وفود کے بین الصوبائی تبادلے بھی ہونے چاہئیں۔ تاکہ مختلف صوبوں کے اہل قلم بھائیوں میں محبت اور یگانگت کی فضا پیدا ہو اور ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے میں آسانی ہو لیکن بعض نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے بلند پایہ ادبی کارناموں کی وجہ سے صوبائی حدود و قیود میں نہیں رہتے۔ ان کی تحریروں میں اتنا زور اور آفاقیت ہوتی ہے کہ وہ دوسری زبانوں میں منتقل ہوکر ان زبانوں کے قاریوں تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔ شیخ ایاز سندھی تھے انہوں نے سندھ کے لیے لکھا لیکن ان کا نام ہمارے لیے اجنبی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج سب مل کر ان کی برسی منا رہے ہیں اور اس سے پہلے بھی منا چکے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان کی شاعری میں جادو تھا۔ ہر انسان چاہے اُس کا تعلق کسی بھی زبان سے ہو اُن کی شاعری کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے۔ انہوں نے کسانوں، مزدوروں اور غریب عوام کے لیے بہت سے گیت اور نغمے لکھے اور اپنے خوبصورت اسلوب میں ایسے ایسے موضوع دیے جو اس سے پہلے سندھی شاعری میں مفقود تھے۔ اتنے اچھوتے تجربے کے لیے کہ سندھی شاعری کا دامن مالا مال ہو گیا۔ انہوں نے جدید سندھی شاعری کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ متروک الفاظ اور ترکیبوں کو نئی زندگی بخشی۔ اُن کی شاعری کا مزاحمتی رنگ سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ ان کی شاعری لوگوں کے جذبات اُبھارنے کا کام دیتی تھی۔ سندھی شاعری کی تاریخ میں شاہ لطیف بھٹائی کے بعد اللہ تعالیٰ نے شیخ ایاز ہی کو اظہار و بیان کا وہ سلیقہ عطا کیا جس کے ذریعے انہوں نے بہت سادگی اور پرکاری کے ساتھ زندگی کے گوناگوں مسائل کو اپنی شاعری کے روپ میں پیش کیا۔ اُن کی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی شاعری، گیت بن کر لوگوں کے لبوں تک آتی رہی۔ شیخ ایاز کی شاعری اصل میں سندھیوں کی آرزوؤں اور اُمنگوں کی آواز ہے۔ اُن کی یہ آواز سندھ کے کونے کونے تک پہنچتی رہی اور طالب علموں، ادیبوں اور شاعروں کی روحوں کو گرماتی رہی۔

انہوں نے کئی عظیم شعراء کی تصانیف کے منبع اور ساخت پر بھی تحقیق کی اور اس طرح ایک پروقار نثر کا سرمایہ بھی اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے چھوڑا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تصانیف کا اُردو میں ترجمہ شاعر کا بہت بڑا کارنامہ ہے جس سے سندھی کلاسیکی شاعری کا چرچا سندھ سے باہر بھی ہونے لگا۔

فہمیدہ ریاض کا کہنا ہے کہ شیخ ایاز کی شاعری اور شخصیت کے دو منفرد پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ دوسرے کسی بھی شاعر کے برعکس ایاز نے شاعری کا فن اپنی زبان کے قدیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی سے سیکھا۔ آپ ایاز کو بھٹائی کا مرید سمجھ سکتے ہیں جن کا ذکر ان کی شاعری میں بار بار آتا ہے اور ان کے لیے ایاز نے کئی نظمیں لکھیں۔ میری نظر سے ایسا کوئی شاعر نہیں گزرا جو اپنی زبان کے کسی قدیم شاعر سے اس قدر محبت کرتا ہو اور اس کے قدموں میں اپنا سر جھکاتا ہو۔ حالانکہ شاعر کی انا اُسے ایسا کرنے نہیں دیتی۔ ویسے تو ایاز کی انا کچھ کم نہ تھی۔ انہوں نے خود بھی لکھا ہے ''یوں تو مجھ میں ''میں''

بہت ہے لیکن بھٹائی کے لیے مزاجاتی طور پر یہ انا پگھل جاتی تھی۔ اُن کی شاعری کا ایک منفرد پہلو یہ ہے جو انہیں بہت بڑی اہمیت دلاتا ہے اور انہوں نے سندھی زبان کو از سرِ نو تخلیق کیا۔ یہ قدرت ایک بہت بڑے شاعر ہی میں ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زبان کا تمام تر حسن و جمال اور طاقت آشکار کر سکے۔ ایاز کا کلام آپ کو سندھی زبان سے محبت کرنے پر اور اس کی اندرونی طاقت پر حیران رہ جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی اُس نے زبان کو وسعت بھی دی۔ شمالی ہند کی کوئی بھی زبان ان کے لیے غیر نہیں تھی۔

ایاز کی شاعری کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ زندہ لفظوں میں بول رہی ہے۔ کوئی لمحہ، کوئی قدر اور کوئی حقیقت وقت کی گود میں دفن ہو کر فنا نہیں ہو گئی بلکہ ایک ابدی زندگی کے خواب کی طرح ان کے اشعار میں آنکھیں کھولے ہوئے ہے اور ایاز ان کو نئے لفظ، نئے جسد اور نئے روپ میں آباد کرتا جا رہا تھا اور انہیں اپنے عہد کی آنکھ دے رہا تھا۔ اُن کی شاعری میں جادو ہے۔ ہر انسان اُن کی شاعری کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے۔ انہوں نے کسانوں، مزدوروں اور غریب عوام کے لیے بہت سے گیت اور نغمے لکھے۔

شیخ ایاز نے اُردو شاعری بھی بڑے بھرپور انداز میں کی۔ وہ ادب کو نوعِ انسانی کا مشترکہ سرمایہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ادب کو قوموں کی بنیاد پر خانوں میں نہیں تقسیم کیا۔ وہ برصغیر کے ادب کو اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھتے تھے۔ ان کی اردو شاعری اس بات کی گواہ ہے کہ وہ اُردو ادب کے بہت مزاج شناس تھے۔ ان کا اردو مجموعۂ کلام ''بوئے گل نالۂ دل'' یا ترجموں کا مجموعہ ''حلقہ میری زنجیر کا'' ناموں کے لحاظ سے غالب کے جن شعروں سے ماخوذ ہیں وہ نہ صرف غالب سے ان کی عقیدت کا ثبوت ہیں بلکہ ان کے اندازِ نظر کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ ان کے ایک اور مجموعہ کلام کا نام ''نیل کنٹھ اور نیم کے پتے'' ہے۔ شیخ ایاز نے نظم و نثر کی بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابوں نے کبھی قدامت پسندوں اور کبھی ترقی پسندوں کو برانگیختہ کیا۔ ان کی حکومت مخالف نظموں نے سندھ میں ون یونٹ کے خلاف اُٹھنے والی تحریکوں کے لیے بہت مواد مہیا کیا۔ کوئی جلسہ یا ریلی ایسی نہیں ہوتی تھی جو ان کی کسی نہ کسی نظم سے شروع نہ ہوتی ہو۔ ان کو سندھ کی آواز کہا جاتا تھا۔ ان کی شخصیت کئی حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ بلکہ عجیب تضادات کا مجموعہ تھی۔ کچھ لوگ انہیں نیک اور پارسا سمجھتے تھے اور کچھ گنہگار۔ بعض کی نظروں میں وہ مردِ مومن تھے اور بعض کے خیال میں ملحد۔ کچھ کے نزدیک وہ محبِ وطن تھے اور کچھ کی رائے میں غدار۔ بعض لوگ انہیں صوفی مانتے تھے اور بعض لادین اور کافر۔ وہ لوگوں میں تضادات کا نشانہ بنے رہے لیکن یہ ان کی غیر معمولی شخصیت کا جوہر تھا جس کی بنا پر انہیں پسند یا ناپسند کیا جا سکتا تھا لیکن ایک شاعر کے طور پر انہیں نظر انداز کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔

آخر پر ان کی اردو شاعری میں سے کچھ شعر پیش کر رہا ہوں:

اک لمحہ تیری محبت کا
زندگی دوام سے بہتر

..........

کوئی بیگانہ کے سوائے دوست
ہر بلندی کا نام پستی ہے

..........

اُن کی چلتی تو حضرت زاہد
ہر تبسم حرام کر دیتے

..........

تم میرے پاس ہوتے ہو پھر بھی
روح کی بے کلی نہیں جاتی

..........

موجۂ خواب پر رواں ہیں ہم
انتہا ہے نہ ابتدا معلوم
پھول کھلتے ہیں تا کہ جھڑ جائیں
مدعائے صبا خدا معلوم

..........

آؤ اب جگمگائیں شامِ خزاں
فکرِ صبحِ بہار کون کرے

..........

ہر زمانے کی ناشناسی سے
زخم خوردہ ہیں باکمال ہیں ہم

❀❀❀

# علی یاسر......صاحبِ ارادہ

اصغر عابد/اسلام آباد

اردو غزل کو ہر دہائی دو دہائی کے عرصے میں نئے خون اور نئی آوازوں کے ذریعے اپنی یافت کی نئی منزلوں کی طرف گامزن رہنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ اردو غزل پر فطرت کا یہ کوئی خصوصی کرم ہے۔ آج غزل کا قافلۂ تخلیق ایک دھج سے رواں دواں ہے۔ اس کارواں میں گذشتہ ربع صدی میں بڑے توانا اور خوبصورت نام جبینِ غزل کا جھومر بنے۔ گزشتہ صدی کی آخری دہائی اور اس صدی کی ابتدائی دہائی میں بھی تازہ کار غزل گوؤں کی ایک کھیپ منظر پر ابھری ہے۔ اسی تازہ کھیپ میں شامل ایک خوبصورت شاعر علی یاسر بھی ہے جس کا پہلا مجموعہ کلام "ارادہ" نستعلیق مطبوعات لاہور کے زیر اہتمام منصۂ شہود پر آیا اور اہل فکر و نظر کی جانب سے اسے ایک خوشگوار مجموعۂ غزل قرار دیا گیا۔ یہ نوجوان شاعر ۱۹۹۳ء سے بڑے تواتر اور توانائی کے ساتھ شاعری کر رہا ہے۔ کتاب سے پہلے اس کا کلام مختلف مشاعروں، حلقۂ اربابِ ذوق کے اجلاس اور ادبی جرائد میں تواتر سے ہمیں محظوظ و متاثر کرتا رہا ہے۔ یوں تو اس نے غزل کے علاوہ نظم، مرثیہ، سلام، منقبت وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اسے نعت اور غزل کہنے میں بہت کمال حاصل ہے۔ علی یاسر کی تازہ تر آواز کا لب و لہجہ اس کے مجموعۂ سخن کے صفحات پر حسن کی طرح جاذبیت لیے ہوئے ہے۔ اس کا جواز اس کے شعروں سے ہی سامنے آ جاتا ہے جب وہ کہتا ہے:

کشتۂ تیرگی انوار میں بیٹھا ہوا تھا
رات میں محفلِ سرکار میں بیٹھا ہوا تھا
نامِ سرکار لیا ہے تو ہوئی ہے تسکین
خوفِ محشر دلِ بیمار میں بیٹھا ہوا تھا

..........

ہنر ملا ہے ہمیں آر پار دیکھنے کا
یہ لوگ جسم کے الماس ہوں گے من کے نہیں
نیا زمانہ، فسادات بھی نئے ہوں گے
زمین کے نہیں، زر کے نہیں ہیں، زن کے نہیں
مگر امید لگائے رہو علی یاسر
درست ہے کہ یہ موسم کسی ملن کے نہیں

..........

اسے یہ چاہیے اپنے خلاف جنگ کرے
کسی محاذ سے جو سرخرو نہیں آیا

علی یاسر کی عمر کے کئی نئے شاعروں میں یہ ایک خوبی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ ان شعراء نے اساتذۂ سخن کے کلام کا مطالعہ بڑے باادب تلامذہ کی طرح کیا ہے۔ کلاسیک سے جدید شعراء سے محبت اور مطالعہ نے اسے ایک خوش کلام غزل گو بنا دیا ہے۔ سمجھدار اور با مطالعہ علی یاسر نے بھی اپنے مجموعے سے قبل متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے قد آور اساتذہ کا بے حد مطالعہ کیا' ان کے مطالعہ کو جذب کیا اور پھر وادئ غزل میں ایک اعتماد اور اطمینان کے ساتھ قدم رکھا۔ اس کا مجموعۂ غزل "ارادہ" اس کے وسعت مطالعہ اور شعر گوئی پر اس کی دسترس کا پتہ دیتا ہے۔

اسے میں غنچۂ دل میں اسیر کیسے کروں
حیات بادِ صبا ہے اور آنی جانی ہے
جو ایک سانس پہ بھاری ہوا ہے دوسرا سانس
یہ تیرے جیسے عزیزوں کی مہربانی ہے

علی یاسر کو مصرع اور شعر کی ساخت کا ہنر کسی مہارت و انعام کی طرح ملا ہے۔ اس نے اس انعامی عطا کو اپنے شعروں میں جا بجا سجا رکھا ہے۔ وہ بڑے مضامین کو بھی سادگئ بیان کے حسن سے لطیف بنا دیتا ہے۔ اس کی غزل اپنے عہد کی اور اپنے زمانے کی آواز نظر آتی ہے کہ وہ اپنی آواز میں شعر کی آواز کو چابکدستی میں شامل کرتا ہوا' اپنی انفرادیت طبع کا اعلان بھی کرتا ہے اور اپنے کیے پر جم کر کھڑے رہنے کا بھی ثبوت فراہم کرتا ہے۔ خوش سلیقگی اس کے ظاہر و باطن میں نظر آتی ہے۔ عروضی و فنی اعتبار سے اس کی قدرت اور مہارت پر رشک آتا ہے۔ مشکل بحروں میں اور مثنوی کی بحر میں وہ بے ساختہ پر تاثیر غزلیں کہتا ہے۔ اس نے یقیناً کئی مصرعے اور کئی شعر اپنی بساط' تربیت اور بہ لحاظ طبع کہے ہیں اور سب سے داد وصول کی ہے۔

رزق سا ہے یہ مقدر میں لکھا ہوتا ہے
فن کسی شخص کی جاگیر نہیں ہو سکتا
کل تمہیں کوئی مصیبت بھی تو پڑ سکتی ہے
ہم فقیروں کی ضرورت بھی تو پڑ سکتی ہے
یہ بھی ہو سکتا ہے زندہ نہ رہوں اس کے بغیر
اور تنہائی کی عادت بھی تو پڑ سکتی ہے

.........

قامت جو نکالنے لگا میں
دنیا سے اٹھا لیا گیا میں
رات اتنا ترے قریب تھا میں
چھو لیتا تجھے جو چاہتا میں
دشوار ہے میری قدر و قیمت
آسانی سے ہوں ملا ہوا میں

.........

آگے والوں کو یہ نہیں احساس
پیچھے والا بھی راہ مانگتا ہے
جنگ کرنی ہے اور مجھ سے ہی
میرا دشمن سپاہ مانگتا ہے

.........

آج کل دھیان کسی اور نہیں پڑتا ہے
پیر دھرتا ہوں کہیں اور کہیں پڑتا ہے
تو نے دیکھا ہی نہیں آنکھ اٹھا کر اس کو
تیرے رستے میں کوئی خاک نشیں پڑتا ہے
مجھ کو تو راہ نکلتی نظر آتی ہے کوئی
بل نہیں یہ جو سر سطحِ جبیں پڑتا ہے

.........

ہر ارادہ لہو کیا تو نے
زندگی سرخرو کیا تو نے
تجھ کو سونپا گیا تھا جتنا کام
کیا اُسے ہو بہو کیا تو نے
یہ تو بتلا کبھی علی یاسر
آنسوؤں سے وضو کیا تو نے

علی یاسر اپنی عمر سے کہیں بڑے خواب دیکھنے کا متمنی دکھائی دیتا ہے۔ خواب یوں بھی عمر کے رہین نہیں ہوتے۔ کسی بھی عمر میں کیسا بڑا خواب نصیب ہو سکتا ہے۔ اس نے خوابوں کو تجربے کی بالکونی سے لا کر اپنے لوگوں کو دیکھنے' سوچنے اور کہنے کا بہت دلچسپ انداز اپنی عادتوں میں شامل کر لیا ہے۔ اپنی فکر کو جمالیاتی بے ساختگی کے ساتھ بیان کرتے ہوئے وہ اپنی طبعی عمر کے پیرے عبور کر کے کسی اور عزم و نگاہ سے بات کرنے لگتا ہے۔

جیسے کوئی کمزور ہو' شہ زور کی زد میں
گھر میرا ہمیشہ سے رہا چور کی زد میں
مچھلی نے شکاری سے کہا اپنی زبانی
تجھ کو بھی کل آنا ہے کسی ڈور کی زد میں

.........

ہم وہ مزدور کہ جو بوجھ کو ڈھوتے ڈھوتے
مر بھی جاتے ہیں' کمائی بھی نہیں ملتی ہے
کیسۂ عشق ترے فیض کے واقف ہم ہیں
مستحق شخص کو پائی بھی نہیں ملتی ہے

اگر دنیا فنا سے پاک ہوتی
تو یہ الزام بھی آتا خدا پر
تو آپس میں لڑائی کس لیے ہے
اگر ہے متفق دنیا خدا پر

مثنوی کی بحر میں یہ خوبصورت شعر اس کی ندرتِ فن اور بے ساختہ انداز کے عکاس ہیں۔

معصوم کہوں میں قاتلوں کو
جا کہہ جو دیا' نہیں کہوں گا
اپنی آواز' اپنا لہجہ
جو سب نے کہا نہیں کہوں گا

.........

جب دیکھو حسد ہی کر رہے ہیں
کچھ لوگ تو حد ہی کر رہے ہیں
احباب مرے خلاف ہو کر
اک طرح مدد ہی کر رہے ہیں

یوں تو شاعری کی کوئی بھی ہیئت ہو' فن عروض کے ترازو میں اوزان و بحور سے ناپ تول کسی بھی شاعر کی مشاقی و پختگی کا ثبوت ہوتی ہے۔ اس فن میں پختگی آتے آتے آتی ہے مگر جس فنکار کو یہ کم عمری میں نصیب ہو جائے اس کا شعر گوئی کا باقی ماندہ سفر عزت و احترام کے ساتھ کٹتا ہے۔ علی یاسر نے اردو غزل کے کلاسیکی شعراء کا مطالعہ ہی نہیں کیا' ان کے اشعار ہزاروں کی تعداد میں صحتِ فن کے ساتھ حفظ بھی کر رکھے ہیں۔ اسی سبب سے اسے فن عروض کی سمجھ بوجھ بدرجہ اتم حاصل ہے۔ اس نے لحظہ موجود کے اساتذہ کے مقام پر فائز سینئر شعراء کی محافل میں بھی کسب فیض کو اپنی عادت بنا لیا ہے جس سے اس کے شعروں میں پہلوداری کا حسن نکھر کر سامنے آیا ہے۔ اس نے بے ساختہ پن' سہل ممتنع' بولتی ہوئی ردیفیں' پیوست قوافی' بنت شعر میں تازہ روی' بولتے ہوئے مفاہیم، منفرد زمینیں' زندگی سے لدے پھدے اشعار، مضامین کی تازہ کاری اور حسن اظہار کی دمک کو کسی مال غنیمت کی طرح سنبھال سنبھال کر

اپنے شعروں کی پرورش میں صرف کیا ہے۔ چھوٹی بحر کے دو ننھے ننھے مصرعوں میں معنی و مفہوم کا قصر تعمیر کرنے کا ہنر بھی علی یاسر کے شعری کمالات کا حصہ ہے۔ اس نے شعری تجربوں کی دنیا میں تیزی سے قدم بڑھائے ہیں جہاں اس کی عمر کے نوجوان ابھی بہت سنبھل سنبھل کر چلتے ہیں، لیکن اس کے مزاج کی انفرادیت اسے آگے بڑھاتی ہے۔ علی یاسر شعری نقد و نظر کی حدود و قیود اور اساتذہ کے بتائے ہوئے پیمانوں کو اپنے تخلیقی سفر میں لحہ بہ لحہ سامنے رکھنے والا شاعر ہے۔

اس بلندی پہ جہاں چاند ستارے بھی نہیں
میری قسمت کا ستارا بھی تو جا سکتا ہے
کیا ضروری ہے کہ میں جاؤں گا ہجرت کے لیے
شہر یہ سارے کا سارا بھی تو جا سکتا ہے

..........

دیکھ لی زمین ساری اور اب ہے تیاری
اے فلک اجازت دے تیری سمت آئیں ہم
تیرگی بھی جائے گی، روشنی بھی آئے گی
اک دیا جلاؤ تم، اک دیا جلائیں ہم

..........

نئے زمانے سے شکوے، شکایتیں تو ہیں
نیا زمانہ خوش امکان ہو بھی سکتا ہے
یہ کیا کہ سب کو اٹھانے لگے ہو در سے تم
کوئی تمہارا ثنا خوان ہو بھی سکتا ہے

..........

جسم نے روح سے سوال کیا
ترا کوئی مزار ہے کہ نہیں
میں نے ایک ایک لہر سے پوچھا
کوئی دریا کے پار ہے کہ نہیں

علی یاسر نے اپنے مجموعہ "ارادہ" کے ابتدائی صفحات میں اپنے اور اپنے خاندانی پس منظر بارے نہایت اجمال کے ساتھ "بے ارادہ" کے عنوان سے بتایا ہے کہ اس کے دادا حضور تقسیم ہند کے وقت اپنا سب کچھ قربان کر کے صرف دولتِ علم و عمل کو ہمراہ لیے لدھیانہ سے پاکستان آئے تھے۔ علی یاسر کے دادا خود شاعری کے دلدادہ تھے۔ وہ پنجابی زبان کے ایک مانے ہوئے شاعر تھے۔ ان کی نگاہ گوہر شناس نے پوتے علی یاسر کے من میں چراغ شعر و سخن روشن کیا جسے زمانے کی ہوائیں گل نہ کر سکیں۔ علی یاسر کا کہنا ہے کہ میری اصل دولت میری شاعری اور میری دوستی ہے جو ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہے۔

علی یاسر کو اپنے بزرگوں، اپنے محسنوں، اپنے دوستوں، اپنے ارادوں اور اپنی یادوں کا لحاظ بھی ہے اور یہ اس پیارے شاعر کا اعزاز بھی ہے کہ اس نے اپنی رفتار کو زندگی کے ادب و آداب کی تزئین کے لیے اپنی فکر کا جزو بنایا ہے۔ وہ ایک خوبصورت زندگی کا تمنائی ہے۔ ایک خوبصورت معاشرے کی تشکیل کے خوابوں کو اپنی جاگتی نیندوں میں آباد کیے قلم و قرطاس کا بھرم بچائے ہوئے ہے۔ علی یاسر کا قلم اس کے دست دعا کی طرح حضور رب میں اظہار تشکر میں مصروف نظر آتا ہے۔ اسے فطرت نے جن صلاحیتوں سے نوازا ہے، انہیں بروئے کار لاتے ہوئے اسے شعر و سخن کے میدان میں ابھی بہت آگے، سب سے آگے جانا ہے۔ یقیناً وہ اپنی نئی منزلوں کو بڑی سہولت کے ساتھ پا لے گا۔ اس کے اندر فقیری اور عاجزی نے جس ترتیب طبع کا احیاء کیا ہے، یہی اس کی تربیت طبع کی کمائی ہے جس میں وہ بہت سرخرو ٹھہرے گا۔ آخر میں اس کے کچھ اور حسین شعر ملاحظہ ہوں۔

اے میرے خدا یہی دعا ہے
میرا فن بے ثمر نہ کرنا
پتھر جھپٹیں گے اس کی جانب
آئینے کو دربدر نہ کرنا
آواز بلند کر کے یاسر
مفہوم کو بے اثر نہ کرنا
اس سے بڑا جہاں میں منافق نہیں کوئی
جو عیب دوستاں کو محاسن قرار دے
ایسے سخی پہ مجھ سے گدا کو ہے ناز، جو
مانگوں جو نان، اونٹوں کی لمبی قطار دے

..........

میں ہوں صاف گو کسی پیش و پس میں نہ آؤں گا
ترا وہم ہے تری دسترس میں نہ آؤں گا
مجھے روک لو میں چلا گیا تو چلا گیا
کسی طور پھر میں تمہارے بس میں نہ آؤں گا

..........

استعاروں پہ بھی پابندی ہے
بات سادہ بھی نہیں کر سکتے
اس کو دینا ہے تسلی بھی کوئی
اور وعدہ بھی نہیں کر سکتے

امید ہے کہ یہ خوش نوا اور جواں فکر شاعر اردو شاعری میں حسین اضافے کرتا رہے گا۔

# دردہی درد (انشائیہ)

محمد ممتاز راشد/لاہور

درد کی دو مشہور قسمیں ہیں۔ ایک جسمانی درد، دوسرا وہ درد جو انسان کسی دوسرے کے لیے دل میں محسوس کرے۔ اُردو ادب میں سب سے پہلے خواجہ میر دردؔ کے حوالے سے یہ لفظ مشہور ہوا۔ پھر کچھ اردو غزلیں ایسی آئیں کہ درد کی فضا عام ہوگئی۔

دل میں جب درد ہو دوا کیجیے
دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجیے

اس غزل کو گلوکارہ ملکۂ ترنم نور جہاں کی آواز ملی تو اور بھی زباں زد عام ہوگئی۔

کچھ اُردو اشعار بھی ایسے تھے جن کے سبب "درد" حافظوں کا حصہ بن گیا:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاقت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اُردو شاعری نامور شاعر حفیظؔ جالندھری تک۔ پہنچی تو انھوں نے بھی "درد" کے موضوع پر ایک منفرد شعر کہہ ڈالا:

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یارب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

اور درویش شاعر ساغر صدیقی تو گویا سراپا درد ہی تھے۔ ان کا ایک مقطع بے حد مقبول ہوا:

فقیہ شہر نے تہمت لگائی ساغرؔ پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

یہ 1960ء کے لگ بھگ کا دور تھا۔ اس دور میں انڈیا کے غزل گائیک طلعت محمود کا گایا ہوا یہ گانا بھی خوب گونجا......

ہم درد کے ماروں کا اتنا سا فسانہ ہے

اسی دور میں انڈین فلم "کشمیر کی کلی" میں نامور کامیڈین کا تکیہ کلام کے بطور گایا گیا یہ مزاحیہ مصرع بھی یار لوگوں نے خوب گنگنایا...... ع یا الٰہی! مٹ نہ جائے دردِ دل (وہ "دردِ دل" کو "دورِ دل" کہتا تھا)۔ یاد آیا کہ حفیظ جالندھری سے قبل علامہ اقبالؔ کی مشہور نظم "شکوہ" کا یہ مصرع بھی کافی مشہور ہو چکا تھا:

ع قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

1960 کا عشرہ زیادہ تر بلیک اینڈ وائٹ فلموں کا زمانہ تھا۔ اس دور میں پاکستانی اُردو فلم "مرد" بنی۔ اس کے ہیرو اعجاز تھے۔ اس میں حزیںؔ صدیقی کے لکھے اور مہدی حسن کے گائے ہوئے یہ نغمے خوب مقبول ہوئے تھے:

تیری محفل سے یہ دیوانہ چلا جائے گا
شمع رہ جائے گی پروانہ چلا جائے گا

تمھیں دیکھوں تمہارے چاہنے والوں کی محفل
محبت کی قسم اتنی کہاں طاقت مرے دل میں

اسی دور میں مہدی حسن نے خواجہ پرویز کے لکھے ہوئے دو ایسے نغمے گائے جن میں "درد" نمایاں تھا:

دلِ ویراں ہے تری یاد ہے تنہائی ہے
زندگی درد کی باہوں میں سمٹ آئی ہے

درد یوں دل سے لگا ہو جیسے
میری چاہت کا صلہ ہو جیسے

مہدی حسن کے گائے ہوئے اس گانے میں بھی "درد" ہی محور و مرکز تھا......

جو درد ملا اپنوں سے ملا
غیروں سے شکایت کون کرے

"ہم درد" کا ذکر اوپر طلعت محمود کے گانے میں آیا ہے۔ گلوکارہ نور جہاں کے گانے میں بھی "ہم درد" کا لفظ دیکھیں:

اب کس کو سنائیں گے ہم درد کا افسانہ
سمجھے تھے جسے اپنا وہ ہو گیا بیگانہ

"ہم درد" یا "ہمدرد" نامی دواخانہ دہلی میں قائم ہوا۔ پھر حکیم محمد سعید نے یہ کراچی میں بھی قائم کیا۔ "ہمدرد" کی دوائیں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ از راہِ تفنن ایک بات...... طلعت اور نور جہاں کے "ہمدرد" والے گانوں اور "ہمدرد" دواخانے کو باہم ذہن میں لائیں تو دلچسپ فضا بنتی ہے۔ اُردو میں درد کی دولت اور درد کی نشانی جیسے مرکبات عام ہیں۔ دردِ سر، دردِ شقیقہ (دردِ کمر)، دردِ زہ، دردِ جگر اور دردِ دل جیسے مرکبات بھی ہیں۔ دردِ سر، آدھے سر کا بھی ہوتا ہے اور پورے سر کا بھی۔ میری ایک غزل کا مطلع بھی "دردِ سر" کے حوالے سے ہے:

سفر کے مرحلے اب دردِ سر بنے ہوئے ہیں
یہ کیسے لوگ مرے ہم سفر بنے ہوئے ہیں

کچھ ستم ظریف اس طرح کے مصرعے بھی کہہ ڈالتے ہیں: ع میرے گھٹنے میں اب ہے دردِ جگر......

واضح رہے کہ "درد" پنجابی زبان میں مؤنث ہے۔ مثلاً درد ہورئی اے...... درداں شروع ہوگیاں نیں...... وغیرہ وغیرہ

# متفرق شاعری (غزلیں)

ممکن تو ہے لیکن کسی صورت نہیں کرتے
ہم دل زدہ اظہار محبت نہیں کرتے
اے جان طلب کرتے ہوئے دشت ادھر آ
اس بستی کے سب لوگ سخاوت نہیں کرتے
یہ کار محبت تو ہے پھر کار محبت
ہم لوگ تو ویسے بھی تجارت نہیں کرتے
سچ بات کہوں یا میں ترا نام چھپاؤں
کس حال میں احباب ملامت نہیں کرتے
صحرائی قبیلے سے تعلق ہے ہمارا
ہم وحشی بگولوں کی اطاعت نہیں کرتے
لوگو تمہیں سو مرتبہ سمجھایا تھا ہم نے
خوشبوئے گریزاں سے محبت نہیں کرتے
یہ جگنو بہت قابل تعظیم ہیں اظہر
کچھ بھی ہو اندھیروں کی حمایت نہیں کرتے

اظہر ادیب/رحیم یار خاں

شب صحرا میں رستہ مل رہا ہے
مرا اس کا ستارہ مل رہا ہے
مجھے کل چھوڑ دینی ہے یہ مسند
ابھی تو شہر سارا مل رہا ہے
کسی دن یہ جگہ اس کو دکھائیں
یہاں دریا سے دریا مل رہا ہے
یقیناً ہے کہیں اک پیڑ جس کا
مری سوچوں کو سایا مل رہا ہے
مرا خیمہ نہیں اب میرا خیمہ
مروت کا نتیجہ مل رہا ہے

مرے چاروں طرف پتھر ہیں پھر بھی
مجھے حسب تمنا مل رہا ہے
عدو کا مسئلہ میں جانتا ہوں
مجھے اس سے زیادہ مل رہا ہے
جو تجھ میں آئینہ خانہ تھا اظہر؟
یہاں تو صرف ملبہ مل رہا ہے

اظہر ادیب/رحیم یار خاں

باب حیرت کھلا، نہیں معلوم
ایسا پہلے ہوا، نہیں معلوم
شور محشر اُٹھا، نہیں معلوم
کس نے کیا کیا کہا، نہیں معلوم
ایک در ہم نے خود کھلا رکھا
کون آیا گیا، نہیں معلوم
ایک تو ہے سو تجھ کو جانتے ہیں
کوئی تیرے سوا نہیں معلوم
وقت کا جبر بھی الگ شے ہے
وقت سے ماورا نہیں معلوم
ضبط گریہ کیا نہیں معلوم
کیسے دریا چڑھا نہیں معلوم
کس تناظر میں تھا نہیں معلوم
کوئی حرف دُعا نہیں معلوم
جشن تو روز تھا، نہیں معلوم
شہر کیوں جل گیا نہیں معلوم
ہم تو خاموش ہو گئے لیکن
تو بھی خوش خوش رہا نہیں معلوم

کون؟ کوثر! نہیں نہیں، کوئی اور
کتنا اچھا لگا؟ نہیں معلوم
ہم بھی کیا خوش گمان ہیں کوثر
خوئے اہل جفا نہیں معلوم

ڈاکٹر کوثر محمود/راولپنڈی

رات کے وقت چاندنی ہے ماں
دھوپ میں چھاؤں اک گھنی ہے ماں
ہم بڑے کیا ہوئے بدل سے گئے
بوڑھی ہو کر مگر وہی ہے ماں
میں جو سب سے چھپائے پھرتا ہوں
میرے وہ دکھ بھی جانتی ہے ماں
لی ہے بچے نے نیند میں کروٹ
کیسے سوتے میں جاگ اُٹھی ہے ماں
روز میں زندہ لوٹ آتا ہوں
جانے کیا پڑھ کے پھونکتی ہے ماں
تھک گئی عمر بھر کی جاگی ہوئی
آج مٹی میں سو گئی ہے ماں
چاند تاروں کے روپ میں اب بھی
آسمانوں سے دیکھتی ہے ماں
ہر دُعا اُس کی جاوداں ہے ندیم
مر بھی جائے تو زندگی ہے ماں

ریاض ندیم نیازی/سبی

کسی کے ہجر کو مقسوم کر لیا ہوا ہے
سو ہم نے دل، دلِ مرحوم کر لیا ہوا ہے

# متفرق شاعری (غزلیں)

بنام عشق ہوس راج کر رہی ہے یہاں
بدن نے رُوح کو محکوم کر لیا ہوا ہے
مرے وجود کی موجودگی خسارا تھی
سو میں نے عکس بھی معدوم کر لیا ہوا ہے
یقین و عدل کے معنی بدل چکے ہیں یہاں
کہ خود کو ظلم نے مظلوم کر لیا ہوا ہے
میں اپنی ذات میں دراصل کس کے ہجر میں ہوں
یہ راز میں نے بھی معلوم کر لیا ہوا ہے
تجھے خبر ہی نہیں میں نے اپنے دامن کو
تری عطاؤں سے محروم کر لیا ہوا ہے

حسن جاوید/لاہور

چلتے ہیں اپنے غم کی نذر ہوتے ہوئے ہم
صحرا کی دھن میں شہر بدر ہوتے ہوئے ہم
تاریکیٔ حیات میں روشن ہماری ذات
اُس پر عجب، کہ صرف نظر ہوتے ہوئے ہم
مُڑ کر کہاں پہ دیکھیں، کہاں کوئی منتظر
محوِ سفر ہیں رنجِ سفر ہوتے ہوئے ہم
گردِ جہاں میں گم ہوئی یوں اپنی داستاں
مٹنے لگے ہیں حرف ہُنر ہوتے ہوئے ہم
باتوں سے اُن کی خوشبو بھرا ہوتا ہوا دل
آنکھوں سے اُن کی زیر و زبر ہوتے ہوئے ہم
جھلمل ملالِ یار کی رم جھم میں عمر بھر
جذب و جنوں میں خاک بسر ہوتے ہوئے ہم

شبہ طراز/لاہور

گھوم رہے ہیں بھیڑ میں تنہا، مَیں اور میری چُپ
ڈھونڈتے ہیں نروان کا لمحہ، مَیں اور میری چُپ
موسم بدلا، قدریں بدلیں، بدلا کُل منظر
بہتے جائیں، وقت کا دھارا، مَیں اور میری چُپ
کب برسے گی پیار کی بارش کب چھائیں گے بادل
جل جائیں گے رفتہ رفتہ، مَیں اور میری چُپ
بانس کا جنگل، دُکھ کی لہریں، مایا دلدل جال
گیانی دھیانی، چشمے، دریا، مَیں اور میری چُپ
تیرا نام ہے اونچا سائیاں، تیرے گہرے راز
ہیں مورکھ، پاپی، نابینا، مَیں اور میری چُپ
سچ کی گھاٹی گہری گھاٹی، منزل کوسوں دُور
کب سے ناپ رہے ہیں رستہ، مَیں اور میری چُپ

شبہ طراز/لاہور

پھیلی ہے مثلِ خوشبو، مری فکر شاعرانہ
ہے غزل مرا تعارف، مرا شعر ساحرانہ
بکھرا ہے کانچ ٹوٹا جیسے درونِ خانہ
تم آؤ شہرِ دل میں، لیکن سنبھل کے آنا
مری زندگی تمہی ہو، یہ کہہ کے پھر گئے وہ
مہنگا پڑے گا اُن کو مرا صبر آزمانا
یوں تو تمہارے بن بھی اچھی گزر رہی تھی
تم سے ملی تو مجھ کو، آیا ہے مسکرانا
وہ دل نشیں سا لہجہ، وہ گفتگو کی خوشبو
نظروں میں آ گیا ہے اب دل کو کیا بچانا
وابستہ ہیں چمن سے مری کمسنی کی یادیں
ہے تتلیوں سے مجھ کو اک ربط عاشقانہ

اس دل کی سلطنت بھی اک درد کا جہاں ہے
ہے یاد کی حکومت ترے غم کا کارخانہ
تہذیب عہد رفتہ ڈھونڈے سے ہی ملے گی
ہے معرضِ خطر میں کہیں رکھ کے بھول جانا
یہ مری زبان اُردو کہیں کھو گئی ہے شاید
مری مخملیں بیاضیں، مرا گمشدہ خزانہ
مری لوحِ زندگی کا عنواں ہی روشنی ہے
میں ادھر ہوں شمعِ محفل تو اُدھر چراغِ خانہ

عرفانہ امر/گوجرانوالہ

نظر کی آنچ پہ یوں برف کا گلاب نہ رکھ
سوالِ وصل پہ منہ پر امر کتاب نہ رکھ
ہے کارِ عشق سے تہذیبِ زندگی کو فروغ
حصارِ عشق میں رہ خوفِ احتساب نہ رکھ
معاملاتِ وفا میں خود اپنا ظرف بھی دیکھ
دیارِ قلب میں بغض و حسد کے باب نہ رکھ
تجھے یہ زعم رہے گا وہ عمر بھر تیرا
یہ آس، اُس سے دلِ خانہ خراب نہ رکھ
کسی کے ہجر میں کاٹی ہے قیدِ ہستی کی
مرے سرہانے کسی کے ملن کے خواب نہ رکھ
بحورِ شعر و ادب ہیں سمندروں کی طرح
اُچھال گوہرِ صد رنگ، زیرِ آب نہ رکھ
کبھی تو گوشۂ تنہائی کے قفس سے نکل
تو لطفِ جان پہ یہ مستقل عذاب نہ رکھ

عرفانہ امر/گوجرانوالہ

# متفرق شاعری (غزلیں)

جب یہ انسان بھی غاروں میں رہا کرتے تھے
درد اک دوسرے کا بانٹ لیا کرتے تھے
آج جن راہوں میں بہتا ہے غریبوں کا لہو
انھی راہوں پہ کبھی پھول کھلا کرتے تھے
اب تو ہم شہر میں ملتے ہیں کھلے عام مگر
گاؤں کے کھیتوں میں ہم چھپ کے ملا کرتے تھے
کھو گئے شور میں اب وہ بھی مشینوں کی یہاں
دل کی دھڑکن کی جو آواز سنا کرتے تھے
اپنی تہذیب کے آداب کا رکھتے تھے خیال
عشق کی آگ میں چپ چاپ جلا کرتے تھے
یوں پلٹ کر نہیں دیتے تھے بزرگوں کو جواب
بے سبب بھی وہ اگر ڈانٹ دیا کرتے تھے
آج ملتے ہی نہیں ہیں جو یہاں آپس میں
ایک ہی گھر میں کبھی مل کے رہا کرتے تھے
یہ وڈیرے یہ لٹیرے ہوں کہ فوجی آمر
یہ تو ہر دور میں ایسے ہی ہوا کرتے تھے
اب تو بس زہر اُگلتا ہے فقط تو عارف
تیری باتوں سے کبھی پھول جھڑا کرتے تھے

عارف شفیق

جینے کی خواہش میں ہی مر جاتے ہیں
ایک کہانی ہے جو سب دہراتے ہیں
شاید گہری نیند میں سونے والا ہوں
آنکھوں میں کچھ سائے سے لہراتے ہیں
اکثر سب کو رستہ دینے والے لوگ
میری طرح سے خود پیچھے رہ جاتے ہیں
چاہے بدن ہو اُس کا سونے چاندی سا
مٹی کو مٹی میں ہی دفناتے ہیں
زندہ رہنے کی اک اندھی خواہش میں
اپنی قبروں پر کتبے لکھواتے ہیں
اک کوئل کی لاش پڑی ہے جنگل میں
محل سرا میں کوے شور مچاتے ہیں
لہو میں اندھی خواہش نے سرگوشی کی
سبز بدن پر کانٹے اُگتے جاتے ہیں
کب دیکھے ہیں ہم نے سو کر جھوٹے خواب
ہم کو ہمارے سچے خواب جگاتے ہیں
بے سمتی کی دھوپ میں اندھے رستوں پر
سر کو جھکائے عارف چلتے جاتے ہیں

عارف شفیق

آخر خود کو یہ سمجھانا پڑتا ہے
دل والوں کے بیچ زمانہ پڑتا ہے
دنیا چاہے جان سے پیاری لگتی ہو
ایک نہ اک دن چھوڑ کے جانا پڑتا ہے
پیار میں جو بھی عہد کرو یہ یاد رہے
مرتے دم تک قول نبھانا پڑتا ہے
جیون میں کچھ ایسے بھی پل آتے ہیں
دیواروں سے راز چھپانا پڑتا ہے
بات بات پہ روٹھنے والوں کو اک دن
اپنے آپ کو آپ منانا پڑتا ہے
بدنامی کا جس پہ دھبہ لگ جائے
اُس کو اپنا آپ چھپانا پڑتا ہے
قیس کی رہ پہ چلنے والوں کو ارشد
صحراؤں کا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے

ارشد محمود ارشد/سرگودھا

اگر اس کو مجھ سے محبت نہیں اب
مرے بھی لبوں پر شکایت نہیں اب
خدارا چلے جاؤ آزاد ہو تم
کبوتر، تمہاری ضرورت نہیں اب
میں اس بار بھی خود منانے گیا تھا
مرے دل میں کوئی ملامت نہیں اب
جلا دوں گا اب آخری بار پڑھ کے
تمہارے خطوں میں بھی راحت نہیں اب
کنول چاہتوں کے ہیں بانٹوں گا ہر سمت
مری تو کسی سے عداوت نہیں اب
روانی تو سانسوں میں آئی ہی تھی شمس
کسی کی بھی دل پر حکومت نہیں اب

شمس رانا/ملتان

حبس پھیلا ہے وہ فضاؤں میں
آگ جیسے لگی ہو چھاؤں میں
اُس کی مانی ہیں منتیں ہر پل
اُس کو رکھا سدا دعاؤں میں
پائی ہے دھوپ سی جلن میں نے
ان درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
میرے ماتھے پہ آ گئے ہیں وسیم
آبلے جس قدر تھے پاؤں میں

وسیم عباس/لاہور

# متفرق شاعری (غزلیں)

یوں ہم نے غمِ ذات کا انداز بنایا
ہر درد ترے درد کا غماز بنایا
وہ خوف جو اک عمر سے سینے میں چھپا تھا
اُس خوف کو ڈھونڈا اُسے آواز بنایا
ٹوٹا نہ کبھی میرا بھرم میرا بھروسہ
جگنو کو شبِ غم میں جو ہمراز بنایا
وہ آہ جو اک عمر سے ہونٹوں میں دبی تھی
نغمے میں اُسے ڈھالا اُسے ساز بنایا
اس دشتِ تمنا میں مرے جذبِ جنوں نے
انجامِ محبت کو ہے آغاز بنایا

وسیم عباس/لاہور

میں جانتا ہوں کہ تجھ کو ہے مجھ سے پیار کہاں
کہ میری بات کا تجھ کو بھی اعتبار کہاں
ہمیں بھی اس کی ضرورت نہیں ہے اب کوئی
اُسے بھی ہم سے مگر اب رہا وہ پیار کہاں
وہ پہلے جیسا خسارا تو نہیں عشق میں اب
وہ پہلے جیسا مگر اب یہ کاروبار کہاں
اب اُن کے سامنے جانے کا فائدہ ہی نہیں
ہمارا آج وہ کرتے ہیں انتظار کہاں
غبار دیکھ کے آیا ہوں قافلے کی طرف
نجانے قافلہ کس جا ہے اور غبار کہاں
اب کوئی مجھ سے میرا حال پوچھتا ہی نہیں
نجانے چھپ کے وہ بیٹھے ہیں غم گسار کہاں
ہم اپنے دل کو بھی خالد منا تو سکتے نہیں
ہمارے دل پہ ہمارا ہے اختیار کہاں

میجر (ر) خالد نصر راجہ/لاہور

جانتا ہوں بہت ہی مشکل ہے
میری آنکھوں میں میری منزل ہے
کیسے کہہ دوں جدا ہے مجھ سے وہ
میری سانسوں میں وہ تو شامل ہے
میرے سب رازدار اپنے تھے
کوئی اپنا ہی میرا قاتل ہے
ہم کو رہنا ہے ساتھ ساتھ ہی راج
میں سمندر ہوں اور وہ ساحل ہے

رئیس راج/ملتان

گھر گڑیا کا یاد کی گرد
میں نے پھر آباد کی گرد
یاد کا دامن جھاڑ دیا
دل نے یوں آزاد کی گرد
مقصد تھا جی بھر کر جینا
جی بھر کر ہر بار کی گرد
عشق جنوں آثار ہوا
میں نے پھر ایجاد کی گرد
میری دھول میں ملنے لگی
پھر میرے ہمزاد کی گرد
صدیوں سوچ کے جنگل میں
اڑتی رہی فریاد کی گرد
گنتی میں کب آتی تھی
یادوں کی تعداد کی گرد
شعر کرن ملنے کر دے
بے دادوں کی داد کی گرد

کرن شفقت/گوجرانوالہ

بھلا کے زیر و زبر رہ گئے تھے جنگل میں
خزاں کے زیرِ اثر رہ گئے تھے جنگل میں
کہ جس سے مات ملی تھی خزاں کے موسم کو
وہ تیغ و دست ہنر رہ گئے تھے جنگل میں
کچھ اس لیے بھی نظاروں کو کھا گئی دیمک
کہ میرے اہلِ نظر رہ گئے تھے جنگل میں
سنا ہے پیڑوں نے خود اپنی شاخیں کاٹی ہیں
نجانے کون سے ڈر رہ گئے تھے جنگل میں
میں منزلوں کے کناروں کو چھو کے آتی مگر
مرے شریکِ سفر رہ گئے تھے جنگل میں
مسافر اس لیے بھی خالی ہاتھ لوٹ آئے
کہ تھک کے راہ گزر رہ گئے تھے جنگل میں
تم اپنی آنکھ میں بھر کر کرن ہی لے آتے
چراغ سارے اگر رہ گئے تھے جنگل میں

کرن شفقت/گوجرانوالہ

ہمیں اپنے بارے بتاتے سہی تم
ہمیں پاس اپنے بلاتے سہی تم
وہی موسموں کی فضا اور ہم ہیں
پرانے وہ قصے سناتے سہی تم
تمہیں عمر بھر ناز رہتا ہمیں پر
کسی دن کبھی آزماتے سہی تم
ہمارا کہاں روٹھنا مستقل تھا
کسی روز ہم کو مناتے سہی تم
یہ ساگر تو دیدار کا تھا ہی طالب
کبھی سامنے تو بٹھاتے سہی تم

صدام ساگر/گوجرانوالہ

# متفرق شاعری (آزاد نظمیں، نثری نظمیں)

## یادِ ایام

موڑ کے شیشے کے باہر
دور پہاڑی کے دامن تک
پیلی سرسوں پھول رہی ہے
نرم ہوا کے جھونکوں سے
جنگلی زیتون کی ڈالی ڈالی جھول رہی ہے
میں کھڑکی سے چہرہ لگائے سوچ رہا ہوں......
وہ بھی کیا دن تھے
جب میں کھیتوں اور کھلیانوں میں سرپٹ دوڑا کرتا تھا
موہے کی چکیلی شاخ پہ پہلا پہلا پھول کھلا تھا
چشمے کی جانب جاتی پگڈنڈی ساری مہک رہی تھی
ترش انار پہ اک کناری چہک رہی تھی
اگلی چار دہائیوں پر
اک گرد کی چادر تنی ہوئی ہے
چشمہ شاید سوکھ گیا ہے
گاؤں کے باہر ٹیلے پر
اک پانی کی ٹینکی بنی ہوئی ہے
میں کھڑکی سے چہرہ لگائے سوچ رہا ہوں

ڈاکٹر کوثر محمود/راولپنڈی

## لہریں...

سرکش لہریں
بار بار ساحلوں کو چومتی ہیں
یاددشت میں اپنا سر پٹکتی ہیں
نہ جانے مجھے یوں کیوں لگتا ہے
کہ یہ دیوانی سی لہریں
ہر بار کنارے پر
دوشیزگی مزیست ڈھونڈنے جاتی ہیں
جو ساحلوں سے پہلی بار مل کر کھوئی تھی...

تن دیپ تمنا/کینیڈا

## شہرِ جاں

ہم اُس شہرِ جاں سے ہو آئے
جہاں تمہاری
یادوں کے کنول کھلتے تھے
ہم اس شہرِ جاں سے ہو آئے
جہاں! سونی تھیں
اس بار تمام گلیاں
دل کے دریچے وا تھے
نہ......!
اشکوں کے دریا وا تھے
ہم اُس شہرِ جاں سے ہو آئے
جہاں! چلتا پھرتا اک وجود
مشتِ خاک ہوا
ہم اُس شہرِ جاں سے ہو آئے
جہاں زمانے ٹھہر گئے
اور ٹھہر کر اک نقطے میں ڈھل گئے

جاوید آفتاب/لاہور

## فتح

میں......!
تمہارے دل کا شہر
فتح کرنے نہیں آیا تھا
صرف......!
محبت کی اس وادیٔ پرخار میں
تمہیں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے
دیکھنا چاہتا تھا
تم نے قدم پیچھے نہیں ہٹائے
میں نے قدم
آگے نہیں بڑھائے
محبتوں میں وصال ضروری نہیں
ہجر بھی تو......
اپنا اپنا مقدر ہے
جو تم سے مجھے ملا
اور......!
وصال......مجھ سے تمہیں ملے گا
تب عشق مکمل ہو کے
ایک نقطے میں ڈھل کر
امر ہوگا
جہاں......میں اور تو کے
فاصلے مٹ جائیں گے
عشقِ حقیقی......!
عشقِ مجازی
میں کوئی فرق نہیں رہے گا

# متفرق شاعری (آزاد نظمیں، نثری نظمیں)

پھر
کس کی جیت ہوگی
نہ کسی کی ہار
یاد رکھنا......!

جاوید آفتاب/لاہور

## تم سے وابستہ اک احساس کے نام

میرا اکرا ہے دسمبر ہے
اور تم ہو
دور تلک ویراں سڑک تنہائی
ہے اور تم ہو
اکیلی رات تھی آسماں پر زمین پر
اترا ہے جو وہ تنہا چاند ہے
اور تم ہو
سنو میرے پاس بہت
قیمتی اک دعا ہے
اور وہ دعا تم ہو
جب دل کی راہ گزر پہ قدم
دھرتی ہوں وہاں اک بستی سی
آباد ہے کوئی مزار ہے
اک سایہ سر میں خاک ڈالے
بین کرتا ہے جو اک دیا
وہاں جلتا ہے وہ تم ہو
بے روح کے بت تمہیں مجھ
سے چھین بھی لیں تو

کیا ہے جاناں
میرے جسم میں اک حرارت ہے
جس کا نام زندگی ہے
اور وہ زندگی تم ہو
تمہیں چھو کر محسوس کرنا چاہوں
جب تم نہیں ملتے
ایسے میں جو آنکھوں میں عکس ٹھہرا
رہتا ہے اور وہ تم ہو
نیند ٹوٹ جاتی ہے رات بھر نہیں آتی
کروٹیں بدلتے یاد آ ستاتی ہے
ٹیس بن کے سر میں اُٹھتی ہے رنجشوں کی
سرخی میں شے اک اُبھرتی ہے
اور وہ تم ہو
دیکھو آج کی رات پھر کہر تمہارا عکس
چرا کر مجھ سے ملنے آئی ہے
میری پلکوں سے اوس کی مانند
اُتر آئی ہے
جاناں جاناں
اور وہ تم ہو

ارسہ مون/شاہ کوٹ

## پہلا خواب

کیا تم میرے ہو سکتے ہو
ہم جو اتنی دیر سے ملے ہیں
درمیاں اتنے جو فاصلے ہیں
بظاہر تو میرا تم پہ کچھ حق ہی نہیں
کسی اور کی رگِ جاں سے
قریب ہو تم
پھر بھی مجھے یہ لگتا ہے
اک عرصے سے مجھ میں کہیں
بسے تم ہی تھے
اب جو اچانک سے ملے ہو
یہ دل دستبردار ہونا نہیں چاہتا
پھر دوبارہ سے تمہیں کھونا نہیں چاہتا
کبھی جگنو کبھی تتلی پکڑتے ہم اکثر
مسکرائے تھے
جانتے ہو کیوں؟ جاناں تم ہمیں یاد
آئے تھے
میرے گھر آنگن میں کھلے پھولوں کی
خوشبو میں بسی شے اک
تمہاری ہے
ان پھولوں کے قریں آنکھیں
موندے تنہائی بسر یوں اپنی کی ہے
میری آنکھیں تھیں منتظر کب سے
میرا پہلا خواب ہو تم
تو کیا تم میرے ہو سکتے ہو؟

ارسہ مون/شاہ کوٹ

# متفرق شاعری (آزاد نظمیں، نثری نظمیں)

## خواہش کی کرچیاں

حسرت و یاس کی تصویر بنا
سڑک کے کنارے کھڑا
دم بخود زمیں پہ
نظریں جمائے
اک اُداس لڑکا
اپنی خواہش کی بکھری ہوئی کرچیاں
نمناک آنکھوں سے
دیکھ رہا تھا وہ کھلونا، جو
دکان سے باہر نکلتے ہوئے
مارے خوشی لرزیدہ ہاتھوں
سے گر کر ٹوٹ چکا تھا

نازاوکاڑوی/لاہور

## دستخط

خواہش کی کرچیاں کیسی ہوتی ہیں
آج مجھے ادراک ہوا
جب میرے سامنے یک جنبش قلم
وہ دستخط کر کے
کسی اور کی ہو گئی
رشتوں یوں بدلتے ہیں
پل بھر میں
میں نے پہلی بار جانا

نازاوکاڑوی/لاہور

## نیلم احمد بشیر کے لیے ایک نظم

یہ لفظوں کا پُل
جو تمہارے مرے درمیاں
تعارف کا اک شاخسانہ
بنا تھا کبھی
خوبصورت بہانہ بنا تھا کبھی
آج وہ دوستی کا گھنا پیڑ ہے
دیکھتی ہوں تمہیں
پیڑ کی اوٹ سے
جس کے سائے میں ہم
وقت کے تیر و ترکش اُٹھانے کے قابل ہوئے
زندگی جھیل جانے کے قابل ہوئے
وحشتوں سے نگاہیں ملانے کے قابل ہوئے
پاؤں میں آبلے
آنکھ میں آنسوؤں کے دیے
میں نے دیکھا تمہیں
میں نے جانا تمہیں
دوستی کے گھنے پیڑ کی اوٹ سے
ہے مری یہ دُعا، مسکراتی رہو
اپنے افکار کے، آئینوں میں سدا جگمگاتی رہو

فرحت زاہد/لاہور

## نیلم احمد بشیر کے لیے نظم

اُسے دیکھتا ہوں
تو لگتا ہے ایسے
وہ جن سرزمینوں
پہ ملتے رہے
روزِ اوّل سے
پیاس اور پانی
یہ مٹی وہاں سے اُٹھائی گئی ہے
جہاں بارشیں ایک پل کے لیے
سانس لیتی نہیں
اس کی تصویر
اُس کی کینوس پر بنائی گئی ہے
اُسے دیکھتا ہوں
تو لگتا ہے ایسے
یہ صورت وہی ہے
کہ جس کی صدا ہر جنم میں
فصیلوں سے ٹکرا کے مرتی رہی ہے
یہ صورت وہی ہے
جو ہر عہد میں
ظلم کے آئینوں سے
نکلنے کی کوشش میں
اپنے ہی قدموں میں گر کر
بکھرتی رہی ہے
اُسے دیکھتا ہوں
تو لگتا ہے ایسے
تراشا گیا اُس کے ہاتھوں کو
ان ساعتوں میں
کہ رب سخن
جن میں لفظوں کو
حرمت عطا کر رہا تھا
قلم کی فضیلت
سوا کر رہا تھا

حسن عباسی/لاہور

# بے وفا ہیرو!

عطاء الحق قاسمی

بہت دنوں سے خواجہ بے وفا لاہوری سے میری ملاقات نہیں ہوئی گزشتہ روز سرراہے مل گئے۔ میں انہیں ایک قریبی ریستوران میں لے گیا میں نے کہا'' خواجہ صاحب جب سے موسم بدلا ہے، آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی؟'' بولے میں موسم کے مزید بدلنے کا انتظار کر رہا تھا''۔ میں نے پوچھا ''خواجہ صاحب، بائی دی وے، آپ کو موسم کون سا پسند ہے؟'' کہنے لگے ''آرام دہ موسم!''

خدا جانے میرے دل میں کیا سمائی کہ میں ان سے فلمی قسم کا انٹرویو کرنے لگا اور خواجہ بے وفا لاہوری نے جس جوش و خروش سے میرے سوالوں کے جواب دیے، اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ ان کے اندر اداکار بننے، اور پھر اس طرح کے انٹرویو دینے کی خواہش بہت شدید ہے چنانچہ میں بھی مزید شیر ہو گیا اور تابڑ توڑ سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''بے وفا صاحب، آپ کو پھول کون سا پسند ہے''

''جس میں خوشبو نہ ہو''

''کوئی پسندیدہ شعر؟''

صداقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

''گویا آپ کو کاغذ کے پھول پسند ہیں!''

''جی ہاں، یہ صرف دیکھنے کے کام آتے ہیں، نہ انہیں قبروں پر چڑھایا جا سکتا ہے نہ یہ کسی کے گلے میں ڈالے جا سکتے ہیں؟''

''تاہم کوئی خوشبو بھی تو آپ کو پسند ہو گی؟''

''جی ہاں، نئے کرنسی نوٹوں کی خوشبو پسند ہے''

''آپ صبح اٹھتے پہلا کام کیا کرتے ہیں؟''

''اخبار پڑھتا ہوں تاکہ پتہ چل سکے کہ کون مضبوط جا رہا ہے!''

''اس کا مقصد''

''اس کا مقصد واضح ہے، جو مضبوط ہو، اس کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ اس سے انسان جلدی اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے!''

''آپ کو اداکار کون سا پسند ہے''

''کوئی بھی نہیں''

''اور اداکارہ''

''سبھی پسند ہیں''

''ہیجڑوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے''

''مجھے بہت پسند ہیں یہ کسی ایک طرف نہیں ہوتے''

''آپ کا پسندیدہ رنگ؟''

''سفید''

''میں نے خون کا رنگ نہیں پوچھا!''

''تو پھر سیاہ''

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ مجھے ماتمی ماحول سازگار ہے۔ انسان کسی کے بھی گلے لگ کر اسے پرسا دے سکتا ہے جبکہ عام حالات میں اس کی صرف تمنا ہی کی جا سکتی ہے!

''آپ نے کبھی کسی سے محبت کی؟''

''جی ہاں! جو شخص محبت نہیں کر سکتا، میں اسے انسان ہی نہیں سمجھتا، میں اب تک ڈیڑھ دو سو محبتیں کر چکا ہوں''

''معاف کیجئے میں پادری نہیں ہوں کہ آپ کنفیشن (Confession) کرنے بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے محبت کا پوچھا ہے اور آپ بڑ ہانکنے لگے ہیں!''

''ایک بزرگ خاتون سے محبت کی تھی!''

''بزرگ خاتون!''

''جی ہاں وہ کوئی ستر کے پیٹے میں تھیں بے اولاد تھیں اور تازہ تازہ بیوہ ہوئی تھیں، میں ان کو دل دے بیٹھا مگر میری یہ محبت آغاز ہی میں ناکام ہو گئی!''

''وہ کیسے''

''مرحومہ نے اپنی ساری جائیداد اپنے ایک دور پار کے عزیز کے نام کر دی مجھے اس کا صدمہ ہوا؟''

''لوگ آپ کو خواہ مخواہ بے وفا کہتے ہیں حالانکہ بیوفائی تو آپ کے ساتھ ہوئی، بہر حال کیا آپ سے کوئی سیاسی سوال بھی پوچھا جا سکتا ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ جنرل پرویز مشرف کی صورت میں پاکستان کو ایک عظیم قائد ملا ہے، وہ پاکستان کی ڈوبتی نیا کنارے پر پہنچا کر رہیں گے، سیاست دانوں نے پاکستان کو تباہ کر دیا ہے؟''

''بے وفا صاحب، میں نے تو جنرل صاحب کے بارے میں آپ سے سوال پوچھا ہی نہیں!''

''مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ یہ سوال پوچھیں ہی نہیں اور یہ زریں موقع میرے ہاتھ سے نکل جائے، جو جواب میں نے اوپر دیا ہے اس کا سوال آپ خود بنا لیں!''

''ٹھیک ہے، آپ یہ بتائیں کہ افغانستان کے بارے میں حکومتی پالیسی آپ کو کیسی لگتی ہے؟''

''بہت اچھی پالیسی ہے، جنرل صاحب کارگل کے ہیرو ہیں چنانچہ وہ جس طرح امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہیں اور جس طرح کے دلیرانہ بیان دے رہے ہیں، یہ انہی کا حصہ ہے۔ انہوں نے پوری جرأت ایمانی سے کام لیتے ہوئے امریکہ سے کہا ہے کہ وہ رمضان کے مہینے میں افغانوں پر بمباری نہ کرے کیا ہمارا کوئی سیاستدان ایسی جرأت کا مظاہرہ کر سکتا تھا؟''

''بالکل نہیں''

''سیاستدان تو احمقانہ باتیں کر رہے ہیں اس کے برعکس پاکستان ہماری جان، سب سے پہلے پاکستان، کتنا اچھا نعرہ ہے!''

''جی ہاں، آخر میں ایک اور سوال'' کیا آپ فلم میں کام کرنا پسند کریں گے؟''

''کیوں نہیں، کیوں نہیں، مگر مجھے اداکاری کرنا نہیں آتی''

''یہ تو آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں، ویسے بھی فلم میں آپ کا کردار بے وفا ہیرو کا ہے اور یوں آپ کو اداکاری کرنا ہی نہیں پڑے گی!''

افسانہ

# خوشبو کی تلاش

نسیم سکینہ صدف/ڈسکہ

میں پھولوں کے دیس میں ہوں۔ میرے ہر طرف گلاب ہیں رنگ برنگے گلاب۔ زرد گلاب، سرخ گلاب، سیاہ گلاب یہ وہی لوگ ہیں جن کی ایک پتی میں میں نے تمہیں تلاش کیا اور خوشبو کی تلاش میں...... کتنا مجھے شوق تھا۔

رنگوں کا خوشبوؤں کا، حسن کا...... کالام، مرغزار سوات کی خوبصورت وادیاں میری زندگی تھیں۔ بس میرا جی چاہتا تھا میں یہاں ہی رہا کروں۔ میں یہاں ہی رہا کروں۔ کبھی نہ واپس آؤں۔ یہاں سے...... میں وہاں جا کر بالکل دیوانی ہو جاتی۔ قدرت کا مجسم اور لافانی حسن ازل سے ابد بکھرا ہوا حسن ہی حسن، برف پوش چوٹیاں، بادلوں سے گھرا آسمان، لق دق اور خاموش جنگل یہاں ہر آواز صدائے بازگشت بن جایا کرتی تھی۔ کتنا شوق تھا مجھے ان سناٹوں کا۔ جہاں کوئی نہ ہو۔ غیر آباد پہاڑ سب کی طرح خوش رنگ بچے، غریب بچے جن کے پاس تن ڈھکنے کے لیے کرتے تک نہ ہوں۔ میں گھنٹوں اُن خوبصورت چہروں کو دیکھتی رہتی۔ یہ دن بہت مختصر ہوتے۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد چند دن سیر و تفریح میں گزر جاتے اور خواب بن جاتے۔ پھر ہم ہوتے اور مشینی زندگی۔ مگر ہر سال یہ دن آتے شاید خواب بن جانے کے لیے۔ میں راستے بھر گانے سنتی، گیت سنتی، حسن کے گیت، خوشبوؤں کے گیت، خوبصورتیوں کے گیت، یہ سب گیت میرے وجود میں بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ساری خوشبوئیں میرے اندر سے نکل نکل کر پھولوں کی پتیوں پر جم جایا کرتیں۔ ان سب چیزوں نے کس قدر امنگ دی تھی۔ کتنی زندگی مزے کی تھی۔ محبت سے لبریز زندگی...... کتنی حسین ہو جاتی ہے۔ ہاں محبت ہی تو تھی جو زندگی کو اتنا خوبصورت بنائے ہوئے تھی اور مجھے ہاں مجھے بھی تو شاید کسی سے محبت تھی کسی سے۔ یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا مگر وہ تھا ضرور کوئی...... جس کا خیال میرے چہرے کو رنگین رکھتا، جس کی خوشبو مجھے پھول کی ہر پتی سے آتی۔ جس کی آواز مجھے ہر گیت میں سنائی دیتی جس کی وجہ سے میں ہر وقت خوش رہتی۔ ہر لمحہ میرے لیے ایک سرور کا لمحہ ہوتا اور پھر نہ معلوم کیسے موسم بدلتے رہے، بدلتے رہے اور بہت کچھ بدل گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا یہ سب کچھ ایسے دیکھتے ہی دیکھتے بدل بھی سکتا ہے۔ مگر کیوں، کیا حسن کی عمر اتنی کم، حسن کو تو میں لافانی سمجھتی تھی۔ میری شادی کر دی گئی۔ شاید خاصا انتظار کر کے کب تک میں اپنے ماں باپ پر بوجھ بنی رہتی اور شادی کوئی ایسی بری چیز بھی نہیں تھی۔ ایک نئی زندگی کا نام ہے۔ شادی، میں نے زندگی کے دوسرے رخ پر قدم رکھا تھا۔ وہ سارے خواب، رنگینیوں کے خواب، خوشبو کے خواب، اُن کو تعبیر ملنے کا وقت آیا تھا۔ پھر میرا دل خوش کیوں نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ مجھے تم سے محبت تھی۔ مگر میں نے تو تمہیں کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ شخص جس سے میری شادی ہو رہی تھی وہ تم ہی تو ہو۔ ہاں یقیناً ایسا ہی ہو گا۔

دنیا کے سارے محبوب ایک ہی شکل کے ہوتے ہیں۔ اگر ان کی بیویوں سے قصے سنو تو معلوم ہوتا ہے کسی عشق کے دیوتا کا ذکر ہے اور شکل دیکھو تو کبھی عشق کرنے کی ہمت نہ پڑے۔ مجھے بھی اپنے خوابوں کی تعبیر ملے گی۔ تمام عورتوں کی طرح اس خیال سے میرا دل قدر مطمئن ہوا، شادی ہو گئی۔ دھیرے دھیرے میرے خواب دھندلانے لگے۔ میری اُمنگیں خاموش ہونے لگیں مگر اس سب کی کوئی وجہ بھی نظر نہ آئی۔ شادی کے بعد میں اپنے شوق کے مطابق اُن ہی خوبصورت جگہوں پر گئی۔ شاید اس بار بہار ایک نئے رنگ میں ہو گی۔ پھولوں کے رنگ اور آگ کے رنگ ایک ہو گئے ہوں گے اور ان میں ندیم کی خوشبو بس گئی ہو گی۔ میں ان وادیوں میں آ کر دوبارہ رہی ہو گی، پاگل دیوانی، جذباتی میں لڑکی...... مگر اچانک مجھے لگا جیسے سارے پھول سوکھ گئے۔ ندیم شاید وہ نہ ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ مگر کسی کو نامعلوم چیز کی نہیں ہوتی۔

جانی پہچانی چیزوں ہی کو تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ میں کیا سوچنے لگی تھی۔ شاید میری سوچ کی وجہ ہوگی۔ مجھے اکثر ندیم کے چہرے پر بڑی سختی نظر آتی۔ فریب نظر آتا، دھوکا نظر آتا، اگر ایسا سب کچھ بالکل ہی نہیں تھا۔ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے تھا۔ تم جو صرف خاکہ ہو، ایک تصور ہو، دشمن ہو تم میرے سکون کے۔ میں نے اس روز سے عہد کر لیا کہ میں اس خیالی ''تم'' کو ختم کر ڈالوں گی۔ پاش پاش کر دوں گی اس کے تصور کو...... زندگی تو ایک حقیقت ہے۔ یہ کوئی کہانی تو ہے نہیں اور حقیقت کو کہانیوں کے رنگ میں نہیں سوچنا چاہیے۔ بہر حال اس کوشش سے یہ بہتر نتیجہ نکلا کہ میں نے خوش رہنا شروع کر دیا۔ پہلے کی طرح گھومنا پھرنا، عیش کرنا۔ مگر اسی زمانے میں ندیم کو کچھ عرصہ کے لیے سعودی عرب جانا پڑا۔ مگر دھیرے دھیرے کچھ عرصہ مہینوں میں بدل گیا۔ نہ میرے پاس ندیم کا پتہ تھا نہ نشاں...... اُن کے وعدے کے مطابق اُن کے فون پر مجھے تمام تفصیلات ملی تھیں۔ جب مہینے سال کے قریب پہنچے تو میری حالت بہت خراب ہوگئی۔ مگر ندیم کا پتہ نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ کہاں کہاں میں نے پتہ نہیں کیا۔ آخر کار وہی ہوا جو میرے دل کی آواز تھی۔ ندیم نے کسی نرس سے شادی کر لی تھی اور وہ اُس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ یہ سردی کی ایک سرد رات تھی۔ جب مجھے یہ خبر ملی۔ میں تھی اور لا فانی تنہائی۔ برف سے چور تنہائی۔ یہاں صرف صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے اور مجھے خیال آیا...... کاش! کاش میں نے تمہارے سہارے زندگی گزار دی ہوتی۔ تم آتے نہ آتے بے وفائی کبھی نہ کرتے۔ میں رُسوائی کی داستاں کیسے سناتی، کہاں آہ و بکا کرتی۔ کیا کرتی...... کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہ بھی زندگی کی حقیقت یا کہانی کوئی فیصلہ کرتا۔ یہاں تک کہ دو برس گزر گئے۔ ایک روز میں پودوں میں پانی ڈال رہی تھی باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔

ایک ٹیکسی رُکی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میں سکتے میں رہ گئی۔ ندیم کی گود میں ایک بچی تھی اور ہاتھ میں بریف کیس۔ میں اُس شخص کی ہمت پر حیران تھی۔ میں سمجھ رہی تھی وہ مجھ سے کچھ جھوٹ بولنے کی کوشش کرے گا اور میں...... میں اُس کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں...... پانی کا پائپ میرے ہاتھ سے گر چکا تھا۔ ندیم بغیر مجھ سے مخاطب ہوئے اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ اُس نے چھوٹی بچی کو بستر پر لٹایا اور بیگ میں سے فیڈر نکالا اور بچی کے منہ میں ڈال دیا۔ یہ کیسا انسان تھا۔ کیوں لے آیا تھا یہ اس بچی کو یہاں...... آخر کیوں؟ کیوں لوٹ کر آیا تھا یہ اس گھر میں۔ مجھے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں دوسرے کمرے میں آ کر لیٹ گئی اسی انتظار میں...... نامعلوم کہ یا محبت کے...... کوئی انتظار تھا ضرور...... مسلسل میرے کان میں کاغذات اُلٹ پلٹ کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا ندیم کے ہاتھ میں دو بریف کیس تھے اور وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد میں اُٹھی۔ میں نے جا کر دیکھا تو وہ واقعی جا چکا تھا۔ مگر بچی...... بچی بے خبر رہی تھی۔ اگر یہ اُٹھ گئی تو میں نے سوچا کیوں نہ اس بچی کو اٹھا کر باہر پھینک دوں۔ مگر ندیم تو واپس آئے گا۔ پھر میں خوف سے کانپ گئی۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے اس کی ماں کو لینے گیا ہو۔ نہیں نہیں مجھے اب اس گھر سے جانا ہوگا۔ ہاں اس گھر سے...... اب یہ گھر...... ہاں گھر بھی میرا نہیں تھا'' نامعلوم زندگی حقیقت ہوتی یا آسانی۔ بچی جاگ گئی تھی۔ سال بھر کی بچی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے۔ بچی چلا چلا کر روتی رہی اور شاید روتے روتے چارپائی سے گر گئی۔ میں اُس طرف بھاگی۔ بچی زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا اور واپس دوسرے کمرے میں آ گئی۔ کتنی بڑی اذیت تھی یہ میرے لیے۔ آخر یہ یونہی کب تک روئے گی اور اُس کی ماں کب آئے گی۔ اُس کی ماں کا خیال آتے ہی مجھے یاد آیا کہ مجھے تو یہاں سے جانا ہے۔ اُس کے آنے سے پہلے پہلے مگر میں کہاں جاؤں...... بچی کی آواز روتے روتے رندھ چکی تھی۔ اب صرف سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں ایک بار پھر بڑھی اور بے اختیار بچی کو اُٹھا لیا۔ ماما...... اوہوں میں کہاں سے آئی اس کی ماما...... اور اس پاگل کو دیکھو چپ بھی ہو گئی۔ بچی اب خاموش ہو چکی تھی۔ شاید رو رو کر تھک چکی تھی۔ سہمی سہمی نڈھال نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی پانی کی بوتل اُس کے منہ میں لگا دی۔ بچی نامعلوم کتنی پیاسی تھی۔ غٹر غٹر پوری بوتل پی گئی اور پھر میرے دوپٹے سے کھیلنے لگی۔ میں سوچ رہی تھی یہ ایک نئی کہانی

ہے۔ اب کیا ہوگا۔ رات ہوگئی۔ ندیم نہیں آیا۔ مگر یہ بچی اس کا کیا ہوگا۔ آخر میں...... میرا اس سے کیا تعلق۔ مگر میں کیا کروں۔ رات کو بھلا یہ کہاں سوئے گی۔ رات بھی ہوئی وہ بچی روئی بھی اور سوئی بھی۔ سبھی کچھ ہوا مگر ندیم نہیں آئے۔ یہ میں کس نئے عذاب میں پڑ گئی تھی۔ آخر یوں کب تک۔ بہرحال دو روز اور گزر گئے۔ میری پریشانی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس بچی کا گلا گھونٹ دوں۔ نامعلوم یہ کمبخت مجھے ماما کیوں کہتی تھی۔ اچھی مصیبت میرے لیے۔ عجیب بچی تھی دو تین روز جو مجھے اُس کے لیے دودھ کا فیڈر تیار کرنا پڑا تو مجھ سے بے حد مانوس ہوگئی۔ اُسے ایک ہی لفظ کہنا آتا تھا ''ماما'' نامعلوم وہ دودھ کے فیڈر کو ماما کہتی تھی یا مجھے۔ ایک روز عجیب اتفاق ہوا۔ میں لان میں بیٹھی تھی دروازے پر بیل ہوئی۔ اس وقت کون ہوسکتا ہے۔ کسی کے آنے کا وقت نہیں۔ دودھ والا بھی آ چکا، کون ہوسکتا ہے۔ میرا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ مجھے لگا کوئی خاص انسان آیا ہے۔ ہوسکتا ہے ندیم واپس آ گئے ہوں۔ ہمیشہ کے لیے میرے ہوکر...... ہاں یہی ہوگا۔ جب ہی میرا دل محبت کی گواہی دے رہا ہے۔ ندیم کو اس نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ ندیم ہی ہیں۔ میرے ندیم...... میں نے دروازہ کھولا...... یہ...... یہ کون تھا میرے سامنے۔ اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ شاداں تم...... تم یہاں...... یہ تمہارا گھر ہے۔ تم یہاں رہتی ہو کب سے؟ جب سے میری شادی ہوئی ہے۔ مگر...... میرے منہ سے برجستہ نکل گیا...... مگر کب...... میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ آیئے اندر کیسے آئے ہیں۔ ساجد خاموش بت کی طرح کھڑا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہاں کس سلسلے میں آیا تھا۔ بچی روتی روتی آئی اور میری ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ میں نے مجبوراً اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اس نے بڑے غور سے بچی کی طرف دیکھا اور بولا اچھا یہ ہے وہ بچی۔ جس کی ماں مر چکی ہے...... کیا...... میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ بچی'' اس کی ماں مر چکی ہے...... مگر...... اس نے کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا تو...... ''یہ تم تھیں ندیم کی پہلی بیوی اور دوسری...... مگر''

تم...... تمہارا اس سب سے کیا واسطہ۔ کیوں آئے ہو تم یہاں تمہیں اس مکان سے بے دخل کرنے جو تمہارے شوہر کا تھا'' ساجد نے لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ ندیم یہ مکان بیچ چکا تھا ساجد کے ہاتھ۔ وہ اس مکان کا مالک تھا اور میں...... ہاں شاداں یہ لفافہ میں نے تمہیں اس لیے دکھایا ہے کہ اب تم اس چھت کے نیچے محفوظ ہو ہمیشہ کے لیے...... اب تمہیں یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ ساجد تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا باہر نکل گیا اور میں حیرت سے تمہارے نقش قدم دیکھ رہی تھی۔ شاید میرے خواب سچے تھے۔ تم ہی دنیا کا سب سے بڑا سچ ہو۔ تم جو محبت ہو سراپا محبت۔ یہ گھر میرا نہیں تھا۔ مگر میں اس گھر میں محفوظ تھی۔ اتنی محفوظ تھی کہ اُس نے نہ صرف مجھے بلکہ میری اس بچی کو بھی پناہ دی جو میری سوتیلی تھی۔ مگر میں بس ماں ہوں اسی خوشیوں کے دیس میں وہ بڑی ہوگئی رنگ اور خوشبو کی تلاش میں......


ممتاز شاعر علی یاسر کے شعری مجموعے

''اِرادہ''

کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے

صفحات: 160 / قیمت: 200

ملنے کا پتہ: نستعلیق پبلشرز

غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور



جدید بیت بازی کے بعد

معروف شاعرہ شکیلہ ستارہ کا مرتب کردہ

قدیم اور جدید شعراء کے اشعار پر مشتمل انتخاب

بے مثال بیت بازی

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے

صفحات: 200 / قیمت: 250

ملنے کا پتہ: نستعلیق پبلشرز

غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور


گو یاد میر جی کی نصیحت ہے کیا کریں
بے زور و زر ہیں اور محبت ہے کیا کریں
ہم لوگ صرف عشق ہی کرتے ہیں چھوڑ دیں
چھوڑا، اور اب جو اتنی فراغت ہے کیا کریں

سیّد امتیاز احمد، لاہور

افسانہ

# دوسرا رُخ

منزہ احتشام گوندل

تصویر کا دوسرا رُخ دیکھو...... یہ کس نے کہا ہے؟ کس بدبخت کی آواز آئی تھی ابھی۔ تصویر کا بھی کبھی کوئی دوسرا رُخ ہوا ہے؟ تصویر ہمیشہ یک رُخی ہوتی ہے۔ یار اس بدبخت کو پکڑو جانے نہ پائے۔ وہ جو کوئی بھی ہے اصل دہشت گرد، تخریب کار تو یہ لوگ ہیں جو لوگوں کو تصویر کا دوسرا رُخ دکھاتے ہیں۔ ان کے پروپیگنڈے میں نہ آنا مارے جاؤ گے۔ کہاں ہے انصاف؟ مذہب قانون، عدل، محبت، لفظوں کے اندر قید ہیں۔ اچھا...... کمال ہے یار۔ تصویر کا تو صرف ایک ہی رُخ ہے اور یہ تو بڑا بھیانک ہے۔ کالی سیاہ دہشت میں ڈالنے والی صورت دیکھ کے اس کے مصور کا خیال آتا ہے۔ جانے وہ کیسا ہوگا؟ یقیناً اپنی تصویر کے جیسا۔ نہیں تو یار...... وہ کہہ رہا تھا مصور بڑا خوبصورت ہے۔ بڑا ٹھنڈا ٹھار، نورانی، سفید اور نازک نازک ہاتھوں والا۔

تم پھر اُس بھڑوے کی باتوں میں آ گئے ہو۔ لعنتی ملامتی انسان۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے حسین مصور کی بنائی ہوئی تصویر اس قدر خوفناک اور بھیانک ہو۔ کیا حسن سے بدصورتی اور بدہیئتی جنم لے سکتی ہے؟

ہاں تو...... وہ کہہ رہا تھا بدصورتی کا ظہور خوبصورتی سے ہوتا ہے۔ تمہاری بحث بے کار ہے۔ عبث ہے۔

تخریب کے اندر ترتیب ہے۔ ترتیب کے اندر تنظیم ہے اور ہر تنظیم کے اندر تخریب ہے۔ دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ دائرہ ٹوٹتا نہیں ہے۔

ہر تنظیم تخریب کا باعث ہے یا تخریب کار ہے۔ تم اس طرح کیوں نہیں کہہ دیتے۔ تخریب کاری کرنے والوں کا اجتماع تنظیم کہلاتا ہے۔ ہاہا ہا...... تم اپنی اس شیطانی کھوکھلی ہنسی کو بند کرو جس کے پیچھے بے بسی اور دکھ کی آنچ سلگتی رہتی ہے۔

تم تو لفظوں کی مار مارتے ہو تو میں کیا کروں؟؟۔ الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا

میں دانا نہیں ہوں۔ الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا۔ اس مصرع کا تعلق تمہاری بکواس کے ساتھ ہے کہ تصویر یک رُخی ہے اور دوسرے مصرع کا تعلق میری منطق سے ہے۔

۔ غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

یعنی تصویر کا دوسرا رُخ دیکھو......

لفظوں کی مار تو تم مارتے ہو۔

صرف میں نہیں یہاں ہر شخص لفظوں کی مار مارتا ہے۔ ہر عالم کا علم اس کے اپنے حقوق کا دفاع کرتا ہے۔ ہر ناطق کی منطق اُس کی اپنی وکالت کے لیے ہے۔ ہر مذہبی عبادت گزار جنت کے اندر اپنے لیے محل بنانے بیٹھا ہے۔ خطیب منبر پہ کھڑا ہو کر لوگوں کو برے اعمال سے منع نہیں کرتا۔ بلکہ خدا کی نیابت کے لیے اپنی راہیں ہموار کر رہا ہوتا ہے۔ ہر وقت خدا کے حضور سربسجود ہونے والے اس لیے زمین پر اپنی پیشانی نہیں ٹیکتے کہ اپنی ذات کی نفی کر سکیں۔ بلکہ اس لیے ٹیکتے ہیں کہ خود کو زمین کے خدا ثابت کر سکیں اور آس پاس والوں کو عذاب الیم کی وعیدیں سنا سکیں۔

کیا ایسا نہیں ہے؟ تصویر کا دوسرا رُخ، تو یہی ہے۔

اس خاتون کو دیکھو وہ جو کونے میں بیٹھی زار وقطار رو رہی ہے۔ جانتے ہو اس کا دکھ کیا ہے؟

دکھ کا تو نہیں پتا لیکن وہ حسن سوگوار کی عملی صورت ہے۔ اس کا دکھ تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔

وہ کونے والی صاحب مزار کی تصویر جس میں ایک خانقاہ کے ساتھ ایک نہایت نورانی صورت بھی موجود ہے۔

تصویر تو بے حد خوبصورت ہے اس کا دوسرا رُخ کیا ہے؟ بدصورتی!!!!

پیر پرست معاشرے کے نام نہاد متقی پرہیزگار، صوم وصلوٰۃ کے پابند، صاحبزادگان معاشرے کے ارنے، بھینسے اور سانڈ ہیں۔ عالم برزخ اور روزِ حشر ان کے بزرگوں کی زبانوں اور نافوں سے نکلا ہے۔ ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ مگر جو ان کے ساتھ بگاڑے اس کا سارا کچھ ہی بگڑ جاتا ہے۔

رقت آمیز لہجوں کے ساتھ تلاوت فرمانے

والے بھی آیات کے تراجم پر غور نہیں کرتے کہ پاکباز عورت پر تہمت لگانے کی سزا کیا ہے؟

جو عورت ان کے غلیظ آسنوں کے نیچے کچلے جانے سے بچ جاتی وہ طوائف، نیکسی، کسبی اور بازاری ہو جاتی ہے اور جس عورت پر ان کو سواری مل جاتی ہے وہ ہر طرح کے فیض سے مشرف یاب ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک جنت کی بشارت ان کے لیے ہے جو اطاعت گزار ہیں۔ فرمانبردار ہیں، جو صلح جو اور اطاعت گزار ہیں۔

اور بے غیرت، کم ذات، نامراد اور گھٹیا ہے وہ عورت جو خدا کے برگزیدہ بندوں کے مقدس بیٹوں پر اپنی ناموس کو ترجیح دے۔ اُس کے لیے جہنم کی بشارت ہے۔ ایسی عورت نافرمان اور ضدی ہے۔ وہ شیطان کی بیٹی اور بہن ہے اور ہر ایسی عورت ہاویے کے اندر جائے گی جو کہ دوزخ کا آخری درجہ ہے۔

مگر تصویر کا تو کوئی دوسرا رُخ نہیں ہوتا۔

ایمان لانا پڑتا ہے کہ یہ تصویر جیسی ہے ویسی ہی ہے۔

اور اگر ایمان نہ لائیں تو......؟ اصرار کریں تو......؟

تو زبان کٹتی ہے...... ہاتھ کٹتے ہیں...... پاؤں کٹتے ہیں۔ آنکھیں نکال دی جاتی ہیں۔ یا پھر......؟

یا پھر؟ یا پھر زہر کے پیالے پینے پڑتے ہیں اور اگر زہر نہ پئیں تو......؟

تو مان لو...... مان لو...... یا پھر زہر پی لو۔

کیا کوئی درمیان کا راستہ بھی ہے؟

خاموشی

مگر جس پر تصویر کا دوسرا رخ عیاں ہو جائے وہ چپ نہیں رہ سکتے۔

چپ نہیں رہ سکتے تبھی دار پہ لٹکتے ہیں۔

خاموشی دار پہ لٹکنے سے زیادہ اذیت ناک ہے۔ تسلیم و رضا اور اطاعت شکنجے ہیں اور یہ شکنجے سچ کا گلا گھونٹنے کے لیے ہیں۔

؎ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

یہ کیا ہے؟ حکومت جاری رکھنے کا کار آمد ترین ٹول۔ ہم لفظوں کے پروپیگنڈے میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ہمارا الفاظ کے ذریعے استحصال کیا جاتا ہے۔

وہ کس نے ہا تھا؟ لفظوں کی کوئی شناخت کوئی وجود نہیں ہے۔

پکڑو اس بدبخت کو جانے نہ پائے۔

یہ سب سے بڑا سفاک دہشت گرد ہے۔

جدید دنیا کا کار آمد ترین بم، الفاظ، لفظوں میں جکڑائی ہوئی قوم اس پیر زادے کو دیکھو۔ اس معصوم لڑکی کو کیا کہہ رہا ہے؟ لڑکی کی عزت خراب کر رہا ہے۔ لڑکی رو رہی ہے...... ڈر رہی ہے۔

ڈرو نہیں میری جان اِنَّ اللّٰہَ جَمِیلُ السِّتر

بے شک اللہ بہترین پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ تم اور میں اللہ کے نیک بندے ہیں۔ وہ ہمارے گناہ کی پردہ پوشی کرے گا۔ وہ اپنے نیک بندوں کو کبھی رُسوا نہیں کرتا۔

دیکھو وہی پیر زادہ منبر پر کھڑا ہو کر کیا کہہ رہا ہے؟

''اور تباہ کن عذاب ہے ان عورتوں کے لیے جو چھپ کر گناہ کرتی ہیں۔''

ان کی باتیں چوکوں، چوراہوں اور بازاروں کے اندر مردوں کے درمیان گردش کرتی ہیں۔ ان کے لیے ہر گناہ جائز ہے۔ کیوں کہ ان کے دادے پردادے ان کی شفاعت کے لیے موجود ہیں۔ ہمارا کیا ہے...... ہم گناہ گار لوگوں کی شفاعت تو ان کے بل بوتے پر ہوئی ہے۔ ان کو خوش رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ دوزخ کا عذاب پکا ہے۔ اب بتاؤ خدا کون ہے؟

میرٹ کا تقاضا حسب ہے یا نسب؟

اگر حسب ہے تو زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن کیوں ہیں؟

میرے بابا جیؒ نے فرمایا: ایک پیر صاحب کے دو لاکھ مرید تھے۔ مگر انہوں نے خلافت اپنے سب سے بڑے بیٹے کو دی۔ کیا ان کے دو لاکھ مریدین میں سے ایک بھی خلافت کے قابل نہ تھا اور اگر ایک بھی خلافت کے قابل نہ تھا تو پھر وہ سارے اُس کے پاس لینے کیا گئے تھے؟

تصویریں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ خالی ہو چکی ہیں۔ یہ کس کے لیے لگائی گئی ہیں اور کیونکر لگائی گئی ہیں۔ عبث ہے سب عبث ہے۔

جو اندھے ہیں وہ تو دیکھ ہی نہیں سکتے اور جو دیکھ سکتے ہیں وہ دھوکہ نہیں کھا سکتے۔

اس شخص کو پکڑو وہ...... وہ جو لفظوں کے ذریعے تخریب کاریاں کر رہا ہے۔ نامراد کہیں کا۔

دیکھو! جانے نہ پائے۔

افسانہ

# نور پور کا کمالا

احمد عدنان طارق

انسانی حقوق کے علمبردار سارے جید مقرر ملکھانوالہ چوک گوجرہ میں آج اکٹھے تھے۔ شکاگو کے مزدوروں کی یادوں کا دن اُن سے یک جہتی دکھانے کا دن۔ پاکستان میں انسانی حقوق کی سب سے بڑی علمبردار خاتون بھی تشریف لا رہی تھیں۔ پنڈال میں سب مزدور رہنما سٹیج پر تشریف فرما تھے اور سٹیج کی اونچائی کے آگے سڑک پر دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ جس پر دور دور سے آئے ہوئے مزدور آلتی پالتی مارے بیٹھے رہنماؤں کی تقاریر کے بھی منتظر تھے اور اپنی زندگی کے مسائل کے بارے میں بھی چپ چاپ سوچ رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی تنکا یا ٹوٹا ہوا کوئی لکڑی کا ٹکڑا تھا جس سے وہ زمین پر ٹیڑھی میڑھی لائنیں لگا رہا تھا جیسے کوئی جوگی کسی کی زندگی کا زائچہ بنا رہا ہو۔ کسی نے شاید ان ٹیڑھی میڑھی لائنز کی طرف توجہ نہیں دی۔ وگرنہ مزدوروں کے مسائل تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ پریشانی میں کھینچی ان لکیروں کے متعلق بھی اگر ریسرچ کی جاتی تو شاید پامسٹری کے مضمون کی کسی شاخ کے طور پر اسے سائنس مان لیا جاتا جس طرح طوعاً وکرہاً یورپ نے ترکی کو اپنا لیا ہے۔ یوسف کے ہاتھ میں بھی اس کی تقدیر کے زائچے بنانے والا ایک تنکا تھا جس سے وہ بھی زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ نہ اسے ان مقررین کے ناموں سے دلچسپی تھی اور نہ ہی واقفیت۔ وہ بھی قریب بیٹھے اپنے مزدور دوست کمالے کے ساتھ اس جلوس میں صرف مزدور اکٹھ کی وجہ سے نور پور سے یہاں آیا تھا۔ جہاں اس کا سدھار کے نزدیک ایک چھوٹا سا کرائے کا گھر تھا۔ جہاں اس کے چھوٹے چھوٹے دو تین بچے ماں کا سر کھا رہے تھے بلکہ چھوٹا بچہ تو رہی سہی کسر اس کا دودھ پی کر پوری کر رہا تھا۔ جھیماں ڈیوٹی کی بڑی پابند تھی۔ صبح بڑے بچوں کو گھر چھوڑ کر چھوٹے کو ساتھ لے جاتی۔ قریبی قصبے میں وہ ایک دو گھروں کا کام کرتی۔ چھوٹے کا دل کرتا تو وہ کام کرتی ماں کے سینے سے لپٹا چسر چسر کرتا رہتا۔ تھک جاتا تو ماں کی اوڑھنی کے پنگوڑے میں لپٹ کر مزے سے جھولے جھلتا۔ یوسف کا کیا تھا وہ تو صبح ہی سے مزدوری کے لیے ایم پی صاحب کی فیکٹری میں چلا جاتا۔ جہاں اسے ماہانہ اُجرت ملتی۔ جس سے گھر کے کرائے کے علاوہ مہینہ بھر کا لیا ہوا ادھار چکایا جاتا۔ پرچون کی دکان کا اُدھار، پڑوسی کے گھر سے لی ہوئی بجلی کا ادھار، کسی بچے کے بیماری کے لیے لیا ہوا اُدھار۔ یہ ادھار وہ ادھار...... جھیماں کوشش کرتی کہ جن گھروں میں وہ کام کرتی تھی وہاں سے کسی بھی قسم کی جھوٹن اسے مل جائے۔ ناشتے میں بچا کھچا کھانا مل جاتا تو وہ دوپہر کے کھانے کے لیے اس کے گھر میں استعمال ہو جاتا۔ ورنہ گھر آ کر وہ اپنے صبح سے بھوکے اور گھر میں قید بچوں کے لیے کوئی دال ساگ بناتی۔ جو رات کو بھی چلتا صرف رات کے کھانے میں یوسف خاندان کے ساتھ شریک ہو جاتا۔ پھر بچوں کو سلا کر رات جھیماں یوسف کی ڈیوٹی کرتی۔ اسے چائے پلاتی۔ پھر اس کی ٹانگیں دباتی۔ یوسف کی ٹانگیں دباتی تو وہ خود آدھی سوئی ہوئی ہوتی اور پھر اس غنودگی میں ہی یوسف کی کوئی اور ڈیوٹی رہ جاتی تو وہ بھی ادا کرتی اور پھر۔ پھر کیا؟ پھر ایک اور صبح ہو جاتی۔

یوسف اور کمالا فیکٹری میں کام کرنے کے بعد گوجرہ آئے تھے مگر پھر بھی ایم پی اے صاحب کے ہرکاروں نے تمام مزدوروں کو واضح الفاظ میں ایک پیغام پہنچا دیا تھا کہ ایم پی اے صاحب اس قسم کے اکٹھ اور جلسے ہرگز پسند نہیں کرتے۔ ماہانہ اجرت میں وہ مزدوروں کو بھی دیر سے تنخواہ نہیں دیتے اور اتنی دیر تک نوکری سے جواب بھی نہیں دیتے۔ جب تک مزدور کے ہڈ پیروں میں جان باقی ہے۔ تو پھر کیسے اکٹھ اور کیسے جلسے۔ مگر پھر بھی مزدوروں کی ضلعی یونین کے لیڈر آ کر نور پور کے مزدور لیڈروں سے ملے اور انہیں کسی نہ کسی طرح گوجرہ آنے پر آمادہ کر ہی لیا۔ نور پور کے مزدور لیڈروں میں کمالا بھی شامل تھا۔ کمالے کے آگے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ بڑے سالوں سے وہ نور پور میں مزدوری کر رہا تھا۔ مگر وہ کہاں سے آیا تھا کیا کر کے آیا تھا پیچھے کون کون چھوڑ کر آیا تھا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اسے کبھی کوئی ملنے نہیں آیا تھا۔ شاید پہلے کوئی پوچھتا ہو مگر اب نہیں۔ اس کا نام کمالا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ کمال کا بندہ تھا ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا جسمانی لحاظ سے بہت تگڑا تھا اور خوبصورت

کڑیل جوان تھا مگر بستی میں کوئی کہانی ایسی نہ تھی جس کا وہ ہیرو ہو لیکن وہ بستی کے کسی مزدور سے زیادتی دیکھتا تو ہمیشہ اس کا ساتھ دینے میں سب سے آگے ہوتا۔ یوسف سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ چھیماں اس کی منہ بولی بہن تھی۔ اس کے بچے اسے چاچا کہتے تھے۔ اس کا کھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اپنی ضرورت کے علاوہ وہ اپنی ساری تنخواہ چھیماں کو دے دیتا۔ کسی نہ کسی صورت میں بھی بچوں کے لیے کچھ لے آتا۔ کبھی یوسف کی مدد کر دیتا اور کبھی کبھار چھیماں کے کچھ پکانے کے درمیان گھر آ جاتا تو شاید اس کا لاشعور اسے اپنی ماں بہن کے ہاتھ سے پکا کچھ یاد دلا دیتا اور وہ اصرار سے چھیماں کے پاس بیٹھ کر بچوں کے ساتھ مٹی کے چولہے سے اُترتی دو روٹیاں کھالیتا۔

یوسف اور کمالے کی دوستی کو سب جانتے تھے اور رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یوسف بھی کمالے کے کہنے پر ہی گوجرہ آیا تھا۔ یوسف شاید کمالے کی بات پوری نہ کرسکتا۔ کیونکہ اس کی جیب میں تو دمڑی بھی نہیں تھی اور نہ ہی گھر میں کوئی وافر نقد رقم بس کسی ناگہانی افتاد سے بچنے کے لیے شاید چھیماں نے چار پانچ سو روپے کسی ٹرنک کے نیچے دبا کر رکھے ہوں تو ہوں۔ مگر نہ یوسف میں ہمت تھی کہ وہ چھیماں سے کہتا کہ وہ جلسے پر جا رہا ہے اور اسے روپوں کی ضرورت ہے نہ ہی چھیماں اسے جلسے میں اپنے ہاتھ سے روپے دے کر بھیجتی۔ کیونکہ اس کی نظر میں تو جلسہ ایسا ہی تھا جیسے گاؤں میں میلہ۔ جسے چھیماں کسی طور پر دیکھ ہی آتی تھی مگر اس طرح کی نوبت آنے سے قبل ہی کمالے نے یوسف کو بتا دیا کہ سواری اور کھانے کا ارزنگ بندوبست مفت ہے۔

ظاہر ہے یکم مئی انسانی حقوق کے لیڈران کا اکٹھ۔ کسی نہ کسی NGO نے تو سپانسر کرنا ہی تھا۔ کیونکہ اپنی باتوں کی وجہ سے پھر بعد میں انہیں NGO کو کسی نے سپانسر کرنا تھا کس نے تو پاکستان میں یہ بتانا ضروری نہیں۔ تقریریں شروع ہوئیں لیڈر مزدوروں کو نئی دنیا میں لے گئے۔ انہیں گھوٹ گھوٹ کر پلایا گیا کہ بیماری تمہاری میں سیٹھ نے تمہارا علاج کروانا ہے۔ مرنے کے بعد تمہارے بچوں کو سرکاری ملازموں کی طرح پنشن دی جانی چاہیے۔ سوشل سیکورٹی کارڈ ملنے چاہئیں۔ ٹانگ بازو کٹنے پر عمر بھر کے لیے کھانے کا بندوبست سیٹھ کرے گا۔ اجرت میں معقول معاوضہ کیا جانا چاہیے۔

ادھر مزدور پنڈال میں تالیاں پیٹ رہے تھے اور ادھر سیٹھ اپنا سر۔ وہ عالمی مزدوروں کے اس دن منانے والوں کو کوس رہے تھے۔ حقوق انسانی کی بات کرنے والوں کو کوس رہے تھے۔ ان کا تو وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ مگر اب انہیں فیکٹری کے مزدوروں کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ ایسی کمیونٹی تھی جس کا بیڑہ غرق وہ کرسکتے تھے۔ یہ ان کا خیال تھا۔ یوسف اور کمالے کی واپسی اسی رات ہوئی تھی مگر اس جلسے کے بعد واپسی صرف انسانی حقوق کے لیڈران کی ہوئی۔ وہ تو اپنی ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں واپس چلے گئے مگر جلسے کے حاضرین کی تواضع کرنے کے لیے گوجرہ کے سیٹھ تیار بیٹھے تھے۔ گوجرہ کے مزدور جن کی ڈیوٹی رات کی تھی جلسے سے سیدھے اپنی اپنی فیکٹری ڈیوٹی پر پہنچے تو بڑے پرامید تھے کہ جلسے میں دیکھے خوابوں کی جلد تعبیر مل جائے گی اور فیکٹری کے وہ مزدور جو سیٹھ کے پروردہ تھے وہ چاہتے تھے کہ جلسے والے مزدور جلدی سے خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آئیں اور اپنی اوقات پہچانیں۔

Conflic of interest نے ظاہر ہے تصادم کے لیے چنگاری کا کام کرنا تھا۔ سو اس نے کیا پہلی رات ہی ڈانگ سوٹا ہو گیا۔ دونوں اطراف کے مزدوروں کے سر کھل گئے۔ جلسے کے باقی شرکا مزدوروں کو واقعہ کا علم ہوا تو وہ نور پور جانے کی بجائے فیکٹری کی طرف روانہ ہو گئے۔ انتظامیہ کو تو حرکت میں آنا ہی آنا تھا۔ مزدور کے جتھے گوجرہ کے دونوں تھانوں میں حوالاتوں کو بھرنے کا موجب بنے۔ مدت کے بعد یوسف اور کمالے کی بستی سے باہر کوئی رات گزری اور وہ بھی حوالات میں۔ صبح گوجرہ کے مزدور لیڈر اپنا ایک مستقل وکیل منتخب کر چکے تھے موصوف گوجرہ کے بہت بڑے وکیل تھے۔ اب وہ مزدوروں سے ماہانہ اُجرت لینے پر آمادہ تھے۔ حالات اچھے ہوں یا برے۔ ان کا ماہانہ پکا تھا اس سے پہلے وہ چنگ چی رکشہ والوں کو ان کے حقوق دلوانے میں خاصی شہرت کما چکے تھے اور اب وہ رکشے والے خوشی خوشی ماہانہ وکیل صاحب کو دیتے تھے اور اب چنگ چی والے اگر ٹریفک رولز کی پابندی نہ بھی کرتے تو انہیں پولیس والوں سے اتنا ڈر نہیں لگتا تھا جتنا پولیس والوں کو وکیل صاحب کے رٹ دائر کرنے سے۔ جیسا وہی وکیل صاحب کا گوجرہ کے مزدوروں سے ماہانہ طے ہوا۔ مزدوروں کو حوالات سے نکلنے میں چنداں تاخیر نہیں ہوئی۔ یوسف اگلے دن گھر پہنچا تو بڑی مدت کے بعد فیکٹری سے پہلی چھٹی وہ کر چکا تھا۔ نور پور کے مزدوروں کے لیے وہی بستی تھی۔ وہی سورج تھا۔ وہی فیکٹری تھی۔ بہت سے مزدوروں کی سوچ وہی تھی مگر

حقیقت یہ تھی کہ ایک دو روز میں ہی ان کے مفاد کے تحفظ کے لیے فیصل آباد میں بھی وکیلوں کی خدمت مستعار لی جا چکی تھی۔ فیصل آباد کے سیٹھ چوکنا تھے۔ سیٹھوں کے گن مین چوکنا تھے۔ جلسے میں جن لیڈروں نے مزدوروں سے کچھ وعدے کیے تھے تو کچھ وعدے لیے بھی تھے۔ مزدوروں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ہر طرح کی قربانی دیں گے۔ سیٹھوں کو ہمیں انسان ماننا ہوگا اور ہمارے بچوں کو انسانوں کے بچے تسلیم کرنا ہوگا۔ مزدوروں نے ہاتھ اُٹھا کر نعرے جلسے میں لگائے تھے۔ سیٹھوں نے فیصل آباد اپنے فیکٹریوں کے ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر اس جلسے کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھی تھی۔ جن مزدوروں کے ذہنوں میں ترقی پسندانہ رجحانات پرورش پا رہے تھے ظاہر ہے کمال انہی مزدوروں میں شامل تھا۔ فیصل آباد مزدور یونین اگلے ہی دن مذاکرات کے لیے نور پور پہنچ گئی۔ بعد میں کھرڑیانوالہ وغیرہ کی باری تھی۔ ایم پی اے صاحب آسانی سے کہاں ہاتھ آنے والے تھے۔ انہیں سو مصروفیت تھیں۔ اجلاس چل رہا تھا وہ پورا سال اجلاس میں نہیں گئے تھے۔ مگر اب وہاں حاضری کی ضرورت تھی اور نور پور سے غیر حاضری کی۔ فیصل آباد کے دوسرے انڈسٹریل زونز کا بھی یہی عالم تھا۔ اس اثناء میں یوسف اور اس کے ساتھ اپنا معمول شروع کر چکے تھے۔ چھیماں کو اس رات گھر سے یوسف کی غیر حاضری میں بڑا ڈر لگا تھا۔ رات کو پہلے تو انجان وسوسوں سے نیند دور بھاگ گئی۔ کچی پکی نیند آئی تو اسے ایسا لگا جیسے وہ یوسف کو دبا رہی ہے۔ پھر اسے لگا جیسے وہ یوسف کی دیگر ڈیوٹیاں پوری کر رہی ہے۔ پھر جیسے اسے اطمینان کا سانس آیا اور وہ بچوں اور نیند سے گڈمڈ ہو گئی۔

اگلے دن یوسف کے آنے سے قبل وہ اپنے بچے کو لے کر ڈیوٹی پر جا چکی تھی یہ سوچ کر کہ اگلی رات وہ دونوں میاں بیوی حقیقت میں اکٹھے ہوں گے۔

یوسف کی کمالے سے اگلے چند روز ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ روٹین سے ہٹ کر بات تھی مگر پریشانی والی نہیں۔ وہ تو خود لوگوں کے مسئلے حل کرنے والا جوان تھا۔ اسے کیا پریشانی ہو سکتی تھی۔ مگر کچھ ہی روز کے بعد معمول کی باتیں خواب ہو گئیں کسی بھی مالک کو اپنے مطالبات پیش ہی نہ کر سکنے کی وجہ سے مزدور یونین نے ضلع بھر میں ہڑتال کی کال دے دی۔ یوسف کی ملاقات کمالے سے ہوئی۔ جو یونین والے جوانوں کے ساتھ رات بستی میں آیا اور سب مزدوروں کو کام پر نہ جانے کا کہہ رہا تھا۔ صبح نور پور سمیت فیصل آباد میں مزدوروں نے کام بند کر دیا۔ لیڈروں کا خیال تھا کہ چار روز فیکٹریاں بند رہیں تو مالکان کے دماغ خود بخود ٹھکانے آ جائیں گے۔

آج ہڑتال کا چوتھا روز تھا۔ ابھی تک مالکان اور مزدور لیڈران کی ملاقات کا کوئی امکان نہ تھا۔ مزدور لیڈران نے اگلے دن پروگرام تبدیل کیا اور جلوسوں کی صورت میں احتجاج شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوسف بھی زندگی میں ویہلا نہیں رہا تھا۔ یہ اس کی سرشت کے خلاف تھا۔ چھیماں کی انگلیاں جیسے یوسف کے پٹھوں کو دبانے میں چلتی تھیں ویسے ہی رات غنودگی میں بھی تندی چلانے کے لیے یوسف کی انگلیاں تڑپتی رہیں بلکہ کبھی تو چھیماں کے جسم پر بھی اس کے ہاتھ اس طرح چلتے رہے جیسے وہ کسی کھڈی پر کام کر رہا تھا۔ وہ بھی جلوس میں شامل ہونے کے لیے تیار تھا کہ ویہلے رہنے سے تو یہ بہتر ہے۔ ویسے بھی باقی مزدوروں کی معیت میں رہنے سے اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ڈیوٹی پر ہی ہے۔ شناسا چہرے اس کے گناہ کا بوجھ کم رہے تھے جو وہ ویہلا رہ کر کر رہا تھا۔ فیصل آباد جھنگ روڈ بند ہو گئی۔ دور دور تک گاڑیوں کی قطاریں لگ گئیں۔ بسوں میں کئی یوسف سارا دن رُل گئے۔ کئی چھیماؤں کے بچے ان کی چھاتیوں سے چمٹے گرمی میں بلکتے رہے۔ مزدوروں کے احتجاج کی خبریں میڈیا کی زینت بن رہی تھیں۔ مالکوں سے پہلے ڈی سی صاحب نے مزدور لیڈروں کو اپنے پاس بلا لیا۔ انہیں سمجھایا گیا اور یقین دلایا گیا کہ ڈی سی صاحب کے دفتر میں مالکان سے ان کے مذاکرات کرائے جائیں گے اور یہ کام دو تین روز میں ہو جائے گا۔

انہوں نے وعدہ پورا کر دیا۔ مذاکرات ہوئے اور پہلی نشست میں ہی ناکام ہو گئے۔ سیٹھ اتنا بڑا خسارہ اتنی جلدی جھیلنے کو قطعی تیار نہیں تھے۔ مگر تین روز کے بعد دوبارہ ہڑتال پر انتظامیہ بہت تیار تھی۔ ڈی سی صاحب احکامات صادر کرنے کے لیے تیار تھے فیصل آباد میں دوسرے انڈسٹریل زونز میں تو یہ تیاریاں تھیں۔ مگر نور پور میں ایم پی اے صاحب کا مخالف فریق اور اس کے حامی مزدور بھی تیار تھے۔ ایم پی اے کی قتل کی دشمنی تھی۔ ان کے پاس بڑے تربیت یافتہ گن مین تھے۔ جو ان کی حفاظت پر معمور تھے۔ ایم پی اے کا مخالف حریف ایم پی اے صاحب کے کسی عزیز کے قتل کے سلسلہ میں جیل میں تھا۔ جس کی بچت کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس کے حواری اس موقعہ کو ہاتھ سے گنوانے کے حق میں قطعی نہیں تھے۔ اب ہڑتال اور ہلڑ بازی شروع ہوئی تو پولیس مزدوروں پر پل پڑی۔ ایم پی اے کے مخالفین پولیس کے نکلنے والی ایک ایک سوٹی کا حساب ایم پی اے سے مانگنے کی کمپین کرتے

رہے۔ اگلے دن بھی یہی عالم رہا۔ مزدور زخمی ہو کر گرتے رہے۔ فیصل آباد کے دوسرے علاقوں سے بھی مزدور نور پور پہنچتے رہے اور فیصل آباد کی بجائے گھمسان کا رن نور پور پڑنے لگا۔ مزدوروں کی طرف سے پتھر اور پولیس کی طرف سے آنسو گیس کا بے دریغ استعمال جاری رہا۔ مخالف زخمی مزدوروں کو قائل کرنے میں کامیاب رہے کہ تمام کیا دھرا ایم پی اے کا ہے۔ یوسف بھی سر پھٹنے کے بعد اپنے گھر میں پٹی کروا کر چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

کمالا رات کو یوسف کو پوچھنے آیا تو یوسف کو بھی سمجھ نہیں تھی کہ چوٹ کیسے لگی۔ پولیس کا ڈنڈا لگا ہے یا اپنے کسی ساتھی کا روڑے نے سر پر زخم کر دیا ہے۔ کمالا اپنے جتنے زخمی ساتھیوں کو پوچھنے گیا سبھی غصے کا شکار تھے۔ بیشتر کو علم نہیں تھا کہ حالات خراب کیسے ہوئے۔ نوبت یہاں تک کیسے پہنچی؟ مگر کمالا اب سو فیصد کلیئر تھا کہ سب کیا دھرا ایم پی اے کا ہے۔ نہ وہ پولیس کو بلاتا اور نہ مار پیٹ ہوتی نہ یوسف کا سر پھٹتا۔ اوپر سے جھیماں کے آنسو جس کو وہ اپنی سگی بہن مانتا تھا۔ جھیماں کو وہ زندگی میں پہلی دفعہ روتے دیکھ رہا تھا۔ جھیماں ایک طرف تو خاوند کی چوٹوں پر رنجیدہ تھی تو دوسری طرف سامنے اپنے ننگے بچوں کو دیکھ کر اسے بھوک بھی ننگی ناچتی نظر آ رہی تھی۔ پتا نہیں اس دفعہ یوسف کو مہینے بعد تنخواہ بھی ملے گی یا نہیں۔ مہینے کا راشن کیسے آئے گا۔ کمالا جھیماں کو بس روتے دیکھتا رہا۔

اگلے دن پھر قیامت صغریٰ کا سماں تھا۔ ایم پی اے کی فیکٹری کے سامنے کھلے میدان میں سینکڑوں مزدور دوبارہ جمع تھے۔ ان مزدوروں میں وہ شامل نہیں تھے جو پھٹڑ ہو چکے تھے یا حوالاتوں میں بند تھے۔ اس دفعہ ان کے لیڈروں میں ایم پی اے کے مخالفین شامل ہو چکے تھے اور ان لیڈروں کے آشیر باد والے مزدور بھی۔ مزدوروں کے مطالبات کہیں دور "راستے میں" رہ گئے تھے۔ وہ راستہ جواب صرف ایم پی اے کی فیکٹری تک جاتا تھا۔ پھر ایک جم غفیر دفعتاً اس راستے کی طرف یلغار کے لیے چل نکلا۔ پولیس کی بکتر بند گاڑیاں، آنسو گیس کے شیل اتنی نفری جنہوں نے بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی تھیں کسی کام نہ آئیں۔ جس کا منہ جدھر کو ہوا ادھر بھاگ نکلا۔ اب ایم پی اے کی فیکٹری تھی جس کے باہر اس کے ذاتی باڈی گارڈ تھے اور سامنے مزدور تھے جن کے لیڈروں میں ایم پی اے کے مخالفوں کے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہی ہوا جو سب چاہتے تھے۔ گولی چلی...... مظاہرین کی اگلی صف میں سے تین چار جوان ڈھیر ہو گئے۔ ہاہا کار مچ گئی۔ مزدور ایک دفعہ پیچھے ہوئے۔ وہی لمحہ تھا دوبارہ پولیس اپنی پوری طاقت سے مزدوروں اور ایم پی اے کی فیکٹری کے درمیان آ گئی۔ سینکڑوں کی تعداد میں مزدور گرفتار ہوئے۔ جو بعد میں اس شرط پر رہا کیے گئے کہ نعشیں ان کے حوالے کی جائیں تاکہ صبح ان کی تدفین ہو جائے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو جھیماں نے بوہا کھولا۔ اس کا منہ بولا بھائی کمالا تھا۔ مگر آج وہ چارپائی پر تھا۔ آگے وہ اکیلا آتا تھا آج بہت سے لوگ اسے اُٹھائے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر آج بھی اس کی مخصوص مسکراہٹ رقصاں تھی مگر چہرے پر مردنی بھی چھائی ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد کی مخصوص پٹیاں اس کی نعش کو صاف کر کے لگائی گئی تھیں۔ جس کے بعد وہ سویا ہوا ہی لگ رہا تھا۔ جھیماں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اس نے چھاتی سے چمٹا بچہ اُٹھا کر چارپائی پر بٹھایا اور دھاڑیں مارتی اپنے بھرا سے چمٹ گئی۔ یوسف بھی اپنے زخم بھول گیا اور اپنے دوست کی چارپائی سے لگ گیا۔ سب کو پتہ تھا کہ کمالے کے عزیز دنیا میں صرف یہی ہیں۔ ادھر تھانہ میں ایم پی اے کے مخالفین کمالے سمیت باقی متوفین کے مدعی بن رہے تھے۔ اب مرنے کے بعد وہی کمالے کے سب کچھ تھے۔ انہیں مکمل اُمید تھی کہ اب ایم پی اے کے خلاف چار قتلوں کے وہ مدعی ہیں۔ صلح کیسے نہیں ہوگی۔ ایم پی اے کے گرفتار بندے جیل میں اس وقت باقاعدہ خوشی منا رہے تھے انہیں اپنی رہائی کا مکمل یقین تھا۔ ایم پی اے صاحب گرفتار ہو کر ڈی پی او صاحب کو اپنا موقف دے رہے تھے کہ وہ تو مزدوروں کے مطالبات ماننے کو بھی تیار تھے اگر ان کے مخالفین اس کو سیاسی رنگ نہ دیتے۔ دل میں وہ بھی خوش تھے کہ شکر ہے وہ پولیس کی حراست میں ہیں۔ مزدور ان تک پہنچ جاتے تو ان کے پرخچے اُڑ جاتے۔

مزدوروں کی تحریک ان شہادتوں سے کامیابی کی طرف گامزن ہو گئی۔ سوشل سیکورٹی کارڈ بھی بننے لگے۔ اجرتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ باقی مطالبات بھی دیر بدیر مان لیے جائیں گے۔ مگر شاید کمالا زندگی میں تنہا تھا ہی اس لیے کہ وہ مزدوروں کے کسی وسیع تر مفاد میں قربان ہو جائے۔ مگر اس نے تھوڑی سی غلطی کر دی جو جھیماں کو بہن بنا لیا۔ جھیماں اس کو بھائی مانتی تھی اس نے ساری زندگی اس کو رونا ہی تھا اور کچھ دن یوسف کے بچوں نے بھی پتھرائی نظروں سے بوہے کی طرف دیکھنا تھا کہ شاید چاچا ان کے لیے کھانے کو کچھ لے کر آئے۔

•

# فلسطین کی تحریک آزادی میں لفظ کی طاقت بھی تلوار جیسی موثر ہے: ڈاکٹر حنان عواد

## محمود درویش اور ابوسلمان کی شاعری نے میرے ادبی اور سیاسی نظریات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا

### عالمی شہرت یافتہ فلسطینی مصنفہ کا عامر بن علی کے ساتھ مکالمہ

(بقیہ: سرورق کے اندرونی صفحے سے)

**ارژنگ:** اب تک کن موضوعات پر لکھ چکی ہیں اور کتنی کتابیں آپ کی شائع ہو چکی ہیں؟

**ڈاکٹر حنان عواد:** آج کل میری سیاسی یادداشتوں پر مشتمل کتاب اپنی اشاعت کے آخری مراحل میں ہے۔ اس کتاب میں فلسطین پر اسرائیل کے ناجائز قبضے کی تمام کہانی بیان کی گئی ہے۔ فلسطینیوں کے مسائل اور ان کی جدوجہد آزادی پر مبنی اس کتاب کے علاوہ میری آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میری تمام شاعری دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ بالخصوص "ہیرو کی واپسی" اور "خاردار تاروں کے پیچھے" نامی کتابیں عالمی سطح پر میرا حوالہ بنی ہیں۔ ان کے تراجم کئی عالمی زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ فلسطین کا مقدمہ ہی میری تحریروں کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ "مرحوم کی یادداشتیں" خالصاً سیاسی موضوع پر مبنی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ تنقید اور دیگر سماجی و ثقافتی موضوعات پر بھی میری کتابیں موجود ہیں۔ پچاس سے زائد اب تک میرے مقالے دنیا بھر کے اخبارات، رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ فلسطین اور مغرب کے اخبارات میں مستقل کالم نگاری بھی کرتی ہوں۔

**ارژنگ:** ادب میں کن لکھاریوں نے زیادہ متاثر کیا؟

**ڈاکٹر حنان عواد:** محمود درویش اور ابوسلمان کی شاعری نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ میرے والد اور اہل خانہ کے بعد میرے سیاسی اور ادبی نظریات کی تشکیل میں ان دو شعراء کرام نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ محمود درویش اور ابوسلمان کی شاعری کی بدولت میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہم الفاظ کے ذریعے پورے عالم کو فلسطین کے عوام کا موقف سمجھا سکتے ہیں۔

**ارژنگ:** پاکستانی ادیبوں کی تحریریں بھی پڑھنے کا موقع ملا؟

**ڈاکٹر حنان عواد:** جی ہاں! مجھے فیض احمد فیض بہت پسند آتے ہیں۔ پاکستان کے خصوصاً ترقی پسند ادیبوں نے بہت اعلیٰ معیار کا ادب تخلیق کیا ہے۔

**ارژنگ:** آپ لکھتی کیا صرف عربی زبان میں ہی ہیں؟

**ڈاکٹر حنان عواد:** نہیں!! عربی کے علاوہ میں انگریزی میں بھی لکھتی ہوں۔ بلکہ میری دو کتابیں تو پہلے انگریزی زبان میں ہی شائع ہوئیں۔ بعدازاں ان کے عربی زبان میں تراجم شائع ہوئے ہیں۔

**ارژنگ:** ہمارے پاکستان میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے عنوان سے دو مختلف نظریات اہل قلم میں پائے جاتے ہیں۔ آپ ان میں سے کون سے نظریے کی قائل ہیں؟

**ڈاکٹر حنان عواد:** ادب برائے زندگی ہی میری نظر میں معتبر بات ہے۔ ادب برائے ادب ایک مقصد تو ہو سکتا ہے لیکن زندگی کی خاطر ادب تخلیق کرنا زیادہ ارفع مقصد ہے۔

## تازہ غزل

درخت رستے میں کیا کھڑا تھا
کہ جیسے مردِ دُعا کھڑا تھا

میں چھوڑ آیا ہوں شہر اپنا
کہ ہر گلی میں خدا کھڑا تھا

کئی زمانوں سے ہوتا ہوتا
میں اس کے نزدیک جا کھڑا تھا

پرندے جب کر رہے تھے ہجرت
میں اک شجر سے لگا کھڑا تھا

کبھی ملاتا تھا جو دلوں کو
وہ گھنٹہ گھر بے صدا کھڑا تھا

کوئی بھی گھر میں نہ ڈھونڈ پایا
میں غم کے پیچھے چھپا کھڑا تھا

تماشا اپنا ہی دیکھنے کو
میں اپنے پہلو میں آ کھڑا تھا

بغیر روئے ہی مر گیا میں
کہ دُکھ سے اتنا بھرا کھڑا تھا

حسن عباسی، لاہور

# سعید قیس / بحرین

مجھ کو اک دن کسی سائے کے حوالے سے بھی دیکھ
سوکھ جاؤں گا یونہی دھوپ میں رکھا رکھا

سعید قیس انسانی جذبہ و احساس کا عکاس اور ترجمان ہے۔ وہ غزل کے لہجے میں ان کیفیات کی اتنی سچی، اتنی کھری اور اتنی خوبصورت تصویریں کھینچتا ہے کہ دورِ حاضر کے شاید ہی کسی غزل گو کو اس طرزِ اظہار تک رسائی حاصل ہو سکی ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ سعید قیس گزشتہ طویل عرصے سے اپنے وطن سے دور ارضِ بحرین میں مقیم ہونے کے باوجود یہاں کی حیاتی فضا اور غزل میں پے در پے شامل ہوتے ہوئے نئے امیجز اور نئی علامات و تشبیہات سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس کا ثبوت اس کی یہ غزلیں ہیں جو ایوانِ غزل میں کئی جدید نوعیت کے دریچے وا کر رہی ہیں اور آنے والی صدی کے کتنے ہی امکانات سمیٹ رہی ہیں۔ (احمد ندیم قاسمی)

دل کو سیراب کیا اور نہ پیاسا رکھا
ہم نے دریا سے عجب جبر کا رشتہ رکھا
شوق تو اُس کو بھی تھا بھیڑ میں کھو جانے کا
جانے کیا سوچ کے اُس نے مجھے تنہا رکھا
تیری سانسوں کی مہک آئے جہاں سے آئے
ہم نے دیوار میں ہر سمت دریچہ رکھا
عزم رکھے تو فصیلوں کے سروں پر رکھے
زخم رکھا تو سمندر سے بھی گہرا رکھا
جس کی گہرائی میں ہم ڈوب سکیں مر بھی سکیں
ہم نے آنکھوں میں وہ دریا تو ہمیشہ رکھا
دل کو رکھا تری یادوں کی نگہبانی میں
اور آنکھوں پہ تری دید کا پہرا رکھا
آرزوؤں کے گھروندے بھی بنائے ہم نے
ذہن میں خوف بھی ہر آن ہوا کا رکھا
یہ بجا دودھ کی نہریں نہ بنائیں ہم نے
یہ کہو ہاتھ سے کب ہم نے یہ تیشہ رکھا
روشنی مجھ کو بلانے مرے گھر تک آئی
اُس نے دیوار پہ مٹی کا دیا کیا رکھا
مجھ کو اک دن کسی سائے کے حوالے سے بھی دیکھ
سوکھ جاؤں گا یونہی دھوپ میں رکھا رکھا
قیس ہی رکھ لیا جب اپنا تخلص ہم نے
کنجِ آغوش میں اک دامنِ صحرا رکھا

نارساؤں کے لیے دستِ رسا بھیجتا ہے
رزق پتھر میں بھی کیڑے کو خدا بھیجتا ہے
عام کر دیتا ہے صحراؤں میں چشموں کا وجود
خشک پتوں کے لیے نرم ہوا بھیجتا ہے
دلِ بلبل میں جگاتا ہے محبت کا شعور
پھر اُسے پھول کی خوشبو کا پتا بھیجتا ہے
روشنی چاند نہ لائے تو وہی غیب کا ہاتھ
شبِ تاریک میں جگنو کو دیا بھیجتا ہے
درگزر کرتا ہے بندوں کو بہ ہنگامِ خطا
اور ماؤں کے لیے حرفِ دعا بھیجتا ہے
دولتِ درد سے بھر دیتا ہے کاسہ دل کا
گنبدِ جاں سے مجھے سچ کی صدا بھیجتا ہے
یاد رکھتا ہے سدا قیس مجھے میرا خدا
جو مجھے میری طلب سے بھی سوا بھیجتا ہے

چاندنی رات مجھے راس نہ آئی مولا
میرے کس کام کی یہ چیز پرائی مولا
یہ مرا جبر سماعت مری رُسوائی ہے
اب مجھے کچھ نہیں دیتا ہے سنائی مولا
کوئی خوشبو نہیں آتی مرے اندر سے مجھے
ابھی زخموں پہ جوانی نہیں آئی مولا
تو نے جس دشت میں رکھا مجھے سائے کے بغیر
خوب میں نے بھی وہاں خاک اُڑائی مولا
دے بشارت کسی قربت کے حوالے سے مجھے
اب سہی جاتی نہیں مجھ سے جدائی مولا
لوٹ لیتا ہے مجھے کوئی سحر سے پہلے
چھین لیتا ہے مری ساری کمائی مولا
کون آئے گا مری آگ بجھانے والا
کون دے گا مجھے جنگل سے رہائی مولا
میرے احوال پہ تو بھی تو نظر رکھتا ہے
در و دیوار پہ اُگنے لگی کائی مولا
جس کی لو سے ہوں مرے دیدہ و دل بھی روشن
تو نے وہ شمع کہاں جا کے جلائی مولا
بات جو میری سمجھ میں نہیں آئی اب تک
میں نے وہ بات کسی کو نہ بتائی مولا
مجھے ورثے کی طلب ہے نہ عطا کی حاجت
کوئی سنتا ہی نہیں میری دہائی مولا
معجزہ قیس مری آگ کے اندر تھا نہاں
جل گیا میں تو اُسے آنچ نہ آئی مولا

بہت ویران کر جاتا ہے مجھ کو
پرندوں کا درختوں پر نہ ہونا

# علی اکبر عباس / اسلام آباد

ہر زاویے سے دیکھ لیا شہرِ حُسن کو
رونق ہمارے دم سے رہی اُس دیار میں

میں اپنے وقت میں اپنی ردا میں رہتا ہوں
اور اپنے خواب کی آب و ہوا میں رہتا ہوں
کبھی زمین، کبھی سیرگاہِ ماہ و نجوم
کبھی میں عکسِ نظر آشنا میں رہتا ہوں
سماعتوں میں اُترتا ہوں مثلِ صوتِ یقیں
دلوں کے واہمہ برملا میں رہتا ہوں
میں اُڑتی گرد ہوں اہلِ ہنر کے تیشے کی
اور اہلِ درد کی بھی خاکِ پا میں رہتا ہوں
میں اک فقیرِ خدا مست، برسرِ دنیا
جمالِ یار کی حیرت سرا میں رہتا ہوں

---

نگاہ و دل کا مدتوں سے رابطہ ہی بند ہے
کھلے ہیں بادباں تو کیا کریں، ہوا ہی بند ہے
پروں میں رات باندھ کر اُڑے ہیں دن کو ڈھونڈنے
بصارتوں کا زعم ہے کہ سوچنا ہی بند ہے
غضب ہیں فاصلے پھلانگ کر ہی طے جو ہوں تو ہوں
عجب ہیں منزلیں کہ جن کا راستہ ہی بند ہے
مسابقت میں مات دے گئے جو، ان سے کیا کہیں
سبق میں ان کے آئینے کا دیکھنا ہی بند ہے
ہنروروں کے ہاتھ کاٹنا بھی ایک ہے ہنر
گلہ بھی اس کا بند ہے اگر، بجا ہی بند ہے

---

پھیل رہی ہے تنہائی بھی ہر سو پھیلتے شہر کے ساتھ
دیکھ رہی ہیں آنکھیں کیا کیا سوتے جاگتے شہر کے ساتھ
دروازوں کے اندر بھی ہے ایک جہاں آباد مگر
اُس کو نسبت کوئی نہیں ہے باہر بستے شہر کے ساتھ
کوئی لباس نیا پہنا کر اُڑ جاتی ہے رات کہیں
دن کے رنگ بھی اور ہوئے ہیں رنگ بدلتے شہر کے ساتھ
ایک ہی راہ پہ چلنے والے ترس گئے ہمراہی کو
کھیل یہ کیسا کھیل رہے ہیں پاگل رستے شہر کے ساتھ
بے مایہ ہے دھوپ کی چاندی بے مصرف سائے کا سونا
آتے جاتے موسم بھی اب چل نہیں سکتے شہر کے ساتھ

---

موسم اُلجھ گیا ہے کہیں نوکِ خار میں
پاؤں پھنچ رہی ہے ہوا انتظار میں
سورج تو دن گزار گیا کوہِ سبز پر
شب چاند نے سکون کیا ریگزار میں
پانی کی موج ہے کہ کوئی عکس اوڑھ لے
شبنم کو لا کھڑا کیا کرنوں کی مار میں
اترا رہے ہیں پھول پرندوں کے ساتھ ساتھ
گیتوں نے رنگ اور دکھائے بہار میں
بجتی ہے ایک بانسری جلتا ہے اک دیا
اک ناؤ بہہ رہی ہے بہاؤ کے پیار میں
ہر زاویے سے دیکھ لیا شہرِ حُسن کو
رونق ہمارے دم سے رہی اُس دیار میں
کس کو ہوس ہے بارِ دگر دیکھنے کی جی
بھر پائے ہم تو آ کے یہاں ایک بار میں

---

لدے ہیں پھولوں سے، پھولوں پہ زر نہیں آتا
یہ کیا شجر ہیں کہ جن پر ثمر نہیں آتا
جڑوں میں ان کے بہت پانیوں کی موت ہوئی
پر ان کا حال بدلتا نظر نہیں آتا
ہوائے سبز یہاں تازہ کار ہو نہ سکی
اور ابرِ سادہ کو بھی یہ ہنر نہیں آتا
نہ مل سکی کسی کونپل کو ہم زباں تتلی
صفیرِ شوق کوئی شاخ پر نہیں آتا
زمیں بچائے گی کب تک انہیں اُکھڑنے سے
کہ رحم آتا ہے ان پر مگر نہیں آتا

---

شام کے سمندر نے چاند کو بلایا ہے
جیسے چھو ہی لے گی ہاتھ لہر نے بڑھایا ہے
چھپ گئے پرندے سب روشنی کے پیچھے کیوں
مچھلیوں نے آنکھوں کا جال سا بچھایا ہے
ساحلوں پہ ٹوٹے ہیں خواب کتنی سیپوں کے
جن کو ہم نے چُن چُن کر میز پر سجایا ہے
بے مہار طوفاں ہے بے شمار موجوں کا
اور اک اشارے پر جو ہوا کے آیا ہے
زندگی تو پانی ہے رات دن کنارے ہیں
کس نے اس سمندر کا ظرف آزمایا ہے

# وحید انصاری/لاہور

مرے بچپن کی یادیں ساتھ لے کر
کوئی تتلی ادھر آئی ہے دیکھو

ہر ستم بھول کر رقص کرتا رہا
وقت کی تال پر رقص کرتا رہا
سو گئے تھک کے سب اہلِ بزمِ طرب
ایک سایہ مگر رقص کرتا رہا
وصل کی دھن میں وہ کرب کے ساز پر
شام سے تا سحر رقص کرتا رہا
اک دیا کیا جلا کھل اُٹھے بام و در
وجد میں سارا گھر رقص کرتا رہا
حسن تھا روبرو ایک بت کی طرح
میرا حسنِ نظر رقص کرتا رہا
آنسوؤں سے دعا بھیگتی ہی رہی
اور دعا کا اثر رقص کرتا رہا
میں مچلتا رہا درد دل سے ادھر
وہ اُدھر رقص پر رقص کرتا رہا
جانتا ہی نہ تھا بھید بھاؤ ہے کیا
فن سے وہ بے خبر رقص کرتا رہا
رات آئی نہیں اس کو محفل کوئی
رہگزر رہگزر رقص کرتا رہا
خودکشی اس نے کی سچ کے خنجر سے پھر
اپنی ہی لاش پر رقص کرتا رہا
میں کہاں تھا وحید اس کو کیا تھی خبر
اپنی دھن میں بھنور رقص کرتا رہا

---

جو بولو جھوٹ تو سچ کا گماں ہو
ابھی فن کار تم ایسے کہاں ہو
ابھی کیا فکر تم کو عاقبت کی
ابھی تم خوبصورت ہو جہاں ہو
کسی سے کیا اسے ہو خوش گمانی
جو اپنے آپ ہی سے خوش گماں ہو
سفر درپیش ہے پھر دوستی کا
سفر ایسا نہ ہو پھر رائگاں ہو
کوئی خوش رنگ تتلی آ کے بیٹھے
کوئی تو شاخِ دل پہ گل عیاں ہو
خلوصِ عزم سے ملتی ہے منزل
وہ تنہا فرد ہو یا کارواں ہو
کرن چاہت کی جو برسائے ہر سو
زمینِ دل پہ ایسا آسماں ہو
محبت کی زباں ساری زبانیں
وہ ماں بولی ہو یا قومی زباں ہو
پسِ مرگِ وفا دونوں ہی خوش ہیں
وحید اب کیا حسابِ دوستاں ہو

---

معتبر نامعتبر کوئی تو ہو
یارا! میرا ہم سفر کوئی تو ہو
موج وطوفاں سے لڑوں کس کے لیے
ساحلِ اُمید پر کوئی تو ہو
رات کے بعد آ رہی ہے رات پھر
درمیاں وقتِ سحر کوئی تو ہو
سلسلہ کب ٹوٹ جائے سانس کا
پاس میرے چارہ گر کوئی تو ہو
بے کسی ہی اب ہمارے ساتھ ہے
تم اُدھر ہو تو ادھر کوئی تو ہو
سب رواں ہیں اپنی اپنی ہی طرف
ذات سے باہر سفر کوئی تو ہو
علم دنیا بھر کا رکھتے ہیں جناب
آپ کو اپنی خبر کوئی تو ہو
اس لیے بزمِ ہنرمنداں میں ہوں
تاکہ ان میں بے ہنر کوئی تو ہو
ان سے ملنے تو چلے ہو پر وحید
مدعا پیشِ نظر کوئی تو ہو

---

وہی کمرے کی زیبائی ہے دیکھو
کہ میں ہوں اور تنہائی ہے دیکھو
بچے گی یا نہیں پھر کشتیِ دل
کسی طوفاں سے ٹکرائی ہے دیکھو
مرے غم کی پذیرائی ہے شاید
کسی کی آنکھ بھر آئی ہے دیکھو
کبھی آنکھوں کی جھیلوں میں اتر کر
کہاں تک ان کی گہرائی ہے دیکھو
ابھی تو ابتدا ہے داستاں کی
ابھی سے تم کو نیند آئی ہے دیکھو
بناتا تھا جو اوروں کو تماشہ
وہ خود اپنا تماشائی ہے دیکھو
مرے بچپن کی یادیں ساتھ لے کر
کوئی تتلی ادھر آئی ہے دیکھو

# حسن جاوید/لاہور

یار حسن جاوید عجیب مصیبت ہے
دیکھے بنا اُس کی تصویر بنانی ہے

---

خود کو ہر ہر طرح جتاتے ہیں
اپنے کردار کو نباہتے ہیں
ہم تعلق بحال رکھتے ہیں
ہم جسے چاہتے تھے چاہتے ہیں
پہلے ہم دکھ پہ چیخ اُٹھتے تھے
اب فقط زخم پر کراہتے ہیں
اپنے ہی آئینوں کے قیدی ہیں
اپنے ہی عکس کو سراہتے ہیں
اپنے گنبد ہیں اپنی آوازیں
اپنا ہی شور سننا چاہتے ہیں

---

کیا کوئی طرفہ تماشا تو نہیں ہونے لگا؟
خاک اُڑانے کا ارادہ تو نہیں ہونے لگا؟
یہ جو دریا سا ہے صحرا تو نہیں ہونے لگا؟
اور جو صحرا ہے وہ دریا تو نہیں ہونے لگا؟
پھر مرے بخت میں وحشت تو نہیں لکھ دی گئی
دشت پھر میرا لبادہ تو نہیں ہونے لگا؟
بھیڑ سی کیوں ہے مرے چاروں طرف لوگوں کی
یہ مرا دل کہیں تنہا تو نہیں ہونے لگا؟
آسمانوں سے اُترتے ہوئے ڈر کچھ تو بتا!!
یہ مرا شہر شکستہ تو نہیں ہونے لگا
میری مہلت تو کہیں ختم نہیں کر دی گئی
مری تقدیر کا لکھا تو نہیں ہونے لگا؟
یہ میں تحلیل سا کیوں ہونے لگا ہوں خود میں
جسم میرا، مرا سایہ تو نہیں ہونے لگا؟

---

اے کوزہ گر ترا سارا کیا دھرا پڑا ہے
مرا وجود ترے چاک سے گرا پڑا ہے
یہ میں پڑا ہوں بدن کے حصار سے باہر
وہ میرا چہرہ پڑا ہے وہ آئینہ پڑا ہے
دھڑک رہی ہے کوئی چیز میرے سینے میں
یہ میں نہیں تو بتاؤ مجھے یہ کیا پڑا ہے
میں اپنے خواب میں جس کو تلاش کر رہا ہوں
مرے خیال میں شاید کہیں مرا پڑا ہے
حصارِ وقت کو توڑوں تو کچھ کھلے مجھ پر
کہاں پہ رکھا ہے الا کہاں پہ لا پڑا ہے
کہ اب تو اشک بھی جیسے فضول لگتے ہیں
یہ کیسا وقت مرے دکھ کو دیکھنا پڑا ہے

---

یعنی میرا ہونا بھی لایعنی ہے
تیری طلب ہے اور وہ بھی امکانی ہے
میرے دل میں کس کی دھڑکن دھڑکی ہے
میری آنکھ میں جانے کس کا پانی ہے
اپنے چہرے سے بس اتنا کہہ دینا
میری آنکھ میں ہر جانب ویرانی ہے
سارے خوابوں کی تعبیریں خواب میں ہیں
میری مشکل ہی میری آسانی ہے
تو بھی ہے کردار کسی افسانے کا
میری حقیقت بھی دراصل کہانی ہے
خاک ہی خاک کے بعد ہے اس کے بعد بھی خاک
اس دنیا میں خاک ہی آنی جانی ہے

---

یار حسن جاوید عجیب مصیبت ہے
دیکھے بنا اُس کی تصویر بنانی ہے

---

ایک خیال کسی آواز کا بنتے ہوئے
خاموشی کو خاموشی سے سنتے ہوئے
سُرخ گلابوں سے ہاتھوں کو بھر لیا ہے
باغ بھری آنکھوں سے کانٹے چنتے ہوئے
بس کچھ ریت بچی ہے میرے ہاتھوں میں
دریا ہوتی آنکھ کا اپنی پنتے ہوئے
ریشہ ریشہ ساری فضا کو بھر دیا ہے
تن کی رُوئی من کے دکھ سے دُھنتے ہوئے

---

یہ اُجالا مرے خوابوں کے چراغوں کا ہے
اور اطراف میں اک شور ہواؤں کا ہے
جیسے اک قبر ہے پھولوں سے معطر کوئی قبر
جس کے چوگرد کوئی رقص ستاروں کا ہے
جس طرح مجھ کو بھگوتی ہے کسی کی اوس
جس طرح مجھ میں کوئی جشن سا صحراؤں کا ہے
جیسے ویران ہوں میں ایک کھنڈر کی صورت
مجھ میں اک پیڑ کوئی پچھلے زمانوں کا ہے
جیسے میں موت کا سناٹا ہوں سیلاب کے بعد
اور اک بین اُجڑتے ہوئے لوگوں کا ہے
میں کسی رات کے سایوں کی حراست میں ہوں
مجھ پہ پہرا انھیں تاریک ہیولوں کا ہے
ان مناظر سے ذرا دور ہی اک گاؤں ہے
اور وہ گاؤں چراغوں کے بزرگوں کا ہے

# سیما غزل/کراچی

خوشبو کے لیے پھول کا عنوان بہت ہے　　　خالی ہی سہی میز پہ گلدان بہت ہے

سیما غزل کی روش عام سے ہٹی ہوئی شاعری کے لالہ زار میں احساس ہوا کی طرح چلتا ہے اور بہت نرم روی مگر تسلسل سے اپنی موجودگی کا اعتراف کراتا ہے؟ سیما کی شاعری میں زندگی کی رایگانی کا خیال، محبت کی شکست و ریخت، افسردگی اور ملال کی چلتی پھرتی تصویریں بناتا ہے۔ یہ ان کے شدید جمالیاتی ذوق سے مل کر ایک ایسی فضا تخلیق کرتا ہے جس میں حُسن کے سوتے بھی چمک ہوتی ہے۔ سیما کے فن کا خمیر یوں تو محبت، دردمندی اور انسان دوستی کے خیال سے اُٹھتا ہے مگر اس مرکز خیال سے اور بہت سے تصورات اور موضوعات بھی جڑے ہوئے ہیں۔ خوبصورت بات یہ ہے کہ انھوں نے محبت کے جذبے کی تطہیر کی ہے اور اسے اتنے اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچایا ہے جو اس جذبے کی پہچان ہے۔

سیما نے شاعری میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ عنوانات اور شاعری میں بہت سی اصطلاحات انھوں نے ایسی شامل کی ہیں جو آج کے وقت کے مطابق نامانوس نہیں لگتیں۔ جیسے ہیلو Sms, in-box نیٹ ورک وغیرہ۔ میرے خیال سے سیما بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی نظمیں اثاثہ، میرا گھر، کاش اور Missing Person پڑھیں تو آپ بھی میرے اس خیال سے متفق ہو جائیں گے۔ سیما کی کتاب میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ ان کی غزلوں کی ردیفیں بہت منفرد ہیں۔ ردیف کا نیا ہونا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ کبھی کبھار تو یہ مضمون سے زیادہ مشکل کام ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں خواب بھی ہیں لیکن حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت بھی جھلکتی ہے۔ (شبنم شکیل)

ہم کو سب کچھ اب تو اپنے دھیان سے دکھتا ہے
چاند کا چہرہ جیسے روشن دان سے دکھتا ہے
جب یادوں کی اُجلی برف پگھلنے لگتی ہے
ایک دھواں سا اُٹھتا آتش دان سے دکھتا ہے
میرا نام بھی لینے والا گھر میں کوئی نہیں
اپنا آپ بھی گھر کے کچھ سامان سے دکھتا ہے
بت خانے تو لوگ سجا کر دل میں رکھتے ہیں
اور خدا تو بس اپنے ایمان سے دکھتا ہے
دھوپ، تپش اور صحرا سب کچھ مٹ جانے کو ہے
دور سے دکھنے والے ریگستان سے دکھتا ہے
شاید خوف سے ہی مر جائیں اس بستی کے لوگ
خالی گھر رہ جائیں گے طوفان سے دکھتا ہے
عشق کا جس نے قصہ لکھا تاج محل بنوایا
اُس کو بھی وہ تاج محل زندان سے دکھتا ہے
سانسوں میں خوشبو اور دھڑکن دھڑکن جس کا نام
سیما لوٹ کے آئے گا امکان سے دکھتا ہے

---

خوشبو کے لیے پھول کا عنوان بہت تھا
خالی ہی سہی میز پہ گلدان بہت تھا
کل شام کی بارش سے ہوئی خوب تباہی
کچھ آپ کی یادوں کا بھی طوفان بہت تھا
تنہائی میں رہتے ہوئے اب ڈر نہیں لگتا
یہ گھر تو ہمیشہ ہی سے سنسان بہت تھا
کچھ اُس کو سلیقہ بھی محبت کا نہ آیا
کچھ اُس میں وفاؤں کا بھی فقدان بہت تھا
جس کو بھی بے کل نہیں دیکھا تھا کسی نے
کل رات وہ محفل میں پریشان بہت تھا
کیوں کر دیا تم نے مجھے پابند سلاسل
مجھ کو تو مری ذات کا زندان بہت تھا

---

## اثاثہ

میں اپنی قیمتی چیزیں بھی اکثر بھول جاتی ہوں
کہیں بھی جا کے ٹھہروں میں، کسی کے پاس بھی جاؤں
کبھی ٹیرس، کبھی آنگن، کبھی کمرے میں بھی اکثر
کچھ اپنی پچھلی یادوں کو، کبھی کچھ چاندراتوں کو
اور اکثر ادھ بنے سے کچھ ادھورے خواب کے گچھے
وہیں پر چھوڑ آتی ہوں
ہمیشہ بھول جاتی ہوں
وہ جو میں آخری موسم میں تم سے ملنے آئی تھی
تو کچھ تارے، چنبیلی کی بہت تھوڑی سی خوشبو
محبت کے سنہری نرم ریشم سے بنے بے ساختہ جملے
یہیں پر رہ گئے میرے
یہاں دیوار پر میں نے چمکتا چاند چھوڑا تھا
فسی کے موتیوں کی ایک مالا تھی جو تم نے گفٹ میں دی تھی
یہیں پر رہ گئی وہ بھی
میں ٹھہروں گی نہیں، مجھ کو بس اپنی قیمتی چیزیں ہی لینی ہیں
تمھیں زحمت بہت ہوگی مگر یہ سب مجھے دے دو
تمہارے پاس تو دنیا کے اب سارے خزانے ہیں
میں خالی ہاتھ بیٹھی ہوں یہی میرا اثاثہ ہے

---

زندہ تو ہوں پہ زیست کی بربادیوں کے بیچ
تنہا رہی ہوں عمر بھر آبادیوں کے بیچ
کھلتے ہوئے گلاب نے وہ دُکھ اُٹھائے ہیں
مرجھا کے رہ گیا ہے وہ شادابیوں کے بیچ
اک آرزو تھی تم سے وہ پوری نہ ہو سکی
اک چین چاہیے تھا جو بیتابیوں کے بیچ
ایسی تپش تھی روح کو جھلسا گئی مری
بارش تو ہو رہی تھی اُنھیں وادیوں کے بیچ
اُس نے تو میرے سامنے دیوار کھینچ دی
پیروں میں بیڑیاں بھی ہیں آزادیوں کے بیچ
یہ تو خبر ہے عدل ہی ناپید ہو چکا
شامل تو پھر بھی ہو گئے فریادیوں کے بیچ

# شاہد ماکلی/لاہور

بنے گا کیا جو توازن بگڑ گیا اس کا ۔۔۔ کہ سارا بارِ امانت ہی خاکدان پہ ہے

خالد احمد مرحوم اگر شعری امکانات کے حوالے سے اپنے نوجوان سخن شناس شعر گو چاہنے والوں میں شاہد ماکلی کو سرِ فہرست رکھتے تھے تو یقیناً موصوف میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو انھیں باقی دوستوں سے جداگانہ حیثیت بخشتی ہے۔ اسی تجسس میں مسودے کا بغور مطالعہ کرنے سے کھلا کہ شاہد ماکلی نے اپنے شعری فن پارے بالکل جدا لسانی پیکروں سے تشکیل دیے ہیں۔ کلام میں بے پناہ پختگی، مفاہیم کی گہرائی اور گیرائی، رموزِ فن سے گہری آشنائی، شعری روایت کا عرفان، جدید تر علامتیں، تہذیبی لب و لہجہ اور گہری عصری حسیت شاہد ماکلی کے وہ شعری محاسن ہیں جو انھیں بھیڑ سے بالکل الگ ایک واضح پہچان عطا کرتے ہیں۔ (اعجاز کنور راجہ)

اور اب نگاہ اُسی آخری نشان پہ ہے
وہ جس کے ہونے کا دارومدار دھیان پہ ہے

یہ کیسی سرحدِ ایام پر مقیم ہوں میں
کہ لازماں کا بھی سایہ مرے مکان پہ ہے

میں چاہے عرش کو جالوں، رہوں گا وہم کا وہم
مرے وجود کی بنیاد ہی گمان پہ ہے

بنے گا کیا، جو توازن بگڑ گیا اس کا
کہ سارا بارِ امانت ہی خاکدان پہ ہے

اب اور ہی کوئی دیکھے گا جاودانی تری
مری تو عمر کا پھیلاؤ ایک آن پہ ہے

میں اپنے ابر کو پہچانتا ہوں اچھی طرح
یہ رم جھم اور جہاں کی مرے جہان پہ ہے

مجھے تو لگتا ہے، چکھ لی ہے روشنی میں نے
کوئی چمکتا ہوا ذائقہ زبان پہ ہے

نہ جانے آپ کہاں ہوں میں اس گھڑی شاہد
بدن زمین پہ ہے، روح آسمان پہ ہے

---

مرے ہی سانس کے بل پر فروغ پاتا ہوا
یہ کیسا شعلہ ہے مجھ میں جگہ بناتا ہوا

یہ ذوق ہے عمل انگیز کی طرح مجھ کو
اُفق اُفق مری رفتار کو بڑھاتا ہوا

ہزار نوری برس پر تھا میری رات سے دن
میں آپ مٹ گیا یہ فاصلہ مٹاتا ہوا

میں اپنے دودھیا رستے سے ہو کے جاتا ہوں
زمیں سے اور کسی کہکشاں کو جاتا ہوا

کہیں نہ اپنی بصارت سے ہاتھ دھو بیٹھوں
اک آفتاب کو میں آئنے میں لاتا ہوا

خواص، جاہیے، کیا تھے دل اور دنیا کے
میں خود جھلس گیا باہم انھیں ملاتا ہوا

کبھی اُترتا ہوا اپنی آخری تہ تک
کبھی میں اپنے کناروں سے لوٹ آتا ہوا

کہیں میں ہوں بھی نہیں اور زمین والوں کو
دکھائی دے بھی رہا ہوں میں جھلملاتا ہوا

پتہ نہیں کہ یہ جھونکا کدھر سے آیا ہے
مری اُداسی کو سرشار کر کے جاتا ہوا

دراصل سب کو مسرت میں کر رہا ہوں شریک
کہیں کا عکس کہیں اور میں دکھاتا ہوا

اور اب تو خود بھی میں ٹکڑوں میں بٹ گیا شاہد
یہ سونتاج کسی کے لیے بناتا ہوا

---

جدا تھے کیمیا دانوں سے کلیات ہمارے
دل و دماغ دھڑکتے تھے ایک ساتھ ہمارے

ہم ایک رت میں اُگاتے تھے پھول دوسری رت کے
کوئی ملاحظہ کرتا عجائبات ہمارے

کبھی خبر میں نہ آئی ہماری خواب نگاری
کسی نظر سے نہ گزرے مسودات ہمارے

اِدھر بھی ایک خلا تھا اُدھر بھی ایک خلا تھا
یہ کس ستارے کے اُوپر تھے خیمہ جات ہمارے

وہ کیسے انفس و آفاق تھے کہ بھی نہیں وہ
اور اُن سے چل بھی رہے تھے تعلقات ہمارے

بدن تھے اور کرن سے بھی تیز تھا سفر اپنا
سو، پیچھے رہ گئے ہم سے دن اور رات ہمارے

رہا نئے سے نئے مرحلے کا سامنا ہم کو
سو، کام آتے بھی کیا پہلے تجربات ہمارے

نتیجہ اور برآمد ہوا تو تب سمجھ آئی
غلط تھے سارے قیاس و مشاہدات ہمارے

بعید ہم سے نہیں ہے کہ خود ہی اُس کو مٹا دیں
کبھی جو آ گیا اپنا سراغ ہاتھ ہمارے

خوشا یہ دھیان کا دھارا جو اپنے ساتھ ہی اب کے
بہا کے لے گیا لمحات بے نشاط ہمارے

وہ بجلی چمکی ہے اس طرح گھپ اندھیرے میں شاہد
دمک اُٹھے ہیں کئی منظر ایک ساتھ ہمارے

# ایزد عزیز/ساہیوال

کپاس چنتی ہوئی لڑکیوں کی قسمت میں　　لکھا ہے کس نے سلگتے ہوئے سے کافسوں

شہرِ غزل ساہیوال میں 70 کی دہائی شعروادب کی سرگرمیوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ مجید امجد ان سرگرمیوں کا مرکز ومحور تھے۔ یہی وہ دور تھا جب نوجوان شاعر ایزد عزیز جن کا نام بھی مجید امجد کا تجویز کردہ تھا۔ شہر کی علمی وادبی ماحول کا حصہ بنے اور اب تو یہ داستان ان کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ایزد عزیز 6 اگست 1954 کو ساہیوال کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گھر میں شعروادب کا چرچا تھا۔ اس گھرانے کے ایک عظیم المرتبت فرد جناب حمید نسیم ایزد عزیز کے چچا تھے جو سٹیشن ڈائریکٹر (کراچی ریڈیو) کے طور پر فرائض منصبی ادا کرتے رہے اور متعدد کتابوں کے خالق تھے۔ صاحب الرائے نقاد کے طور پر ان کا مقام مسلم ہے۔ ایزد عزیز اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے صاحب طرز ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کا اولین مجموعہ ''غروبِ شب'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد افسانوں کی کتاب ''عالم ارواح کی مال روڈ پر'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ حمد، نعت، منقبت اور سلام کا مجموعہ ''تسلیم'' کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ''کلے رکھ اوئین'' ان کی پنجابی نظموں کی کتاب ہے۔ ''سطریں'' ''کاغذ نب تحریر اور'' ''دوام'' کے متعدد شمارے ان کی بطور مدیر صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آج کل وہ اپنی خودنوشت اور نظم ونثر کی کلیات پر کام کر رہے ہیں۔ (واصف سجاد)

کبھی ہوا، کبھی ابرِ رواں کے ساتھ چلوں
کہ سب مناظرِ فطرت سپردِ خامہ کروں
اُتاروں آنکھ میں حیرت کے اس تسلسل کو
میں شش جہات میں اُڑتا ہوا پرندہ ہوں
کپاس چنتی ہوئی لڑکیوں کی قسمت میں
لکھا ہے کس نے سلگتے ہوئے سے کافسوں
نجانے کس کے بدن سے سمٹ کے آیا ہے
ٹپک رہا ہے جو چلتی ہوئی مشین سے خوں
یہ پتھروں سے لڑھکتے ہوئے حسیں چشمے
جو فرقِ سنگدلاں پر بہیں تو پھر جانوں
وہ اپنے حُسن کے پرتو کی اوٹ میں ہے کہیں
میں جس کے نام کی تسبیح دھڑکنوں میں سنوں
اُسی کی دین ہیں ایزد یہ سب گلاب غزل
مجھے ہے اذن کہ شاخِ خیال سے چن لوں

طوفاں میں ٹھہرنا چاہتا ہوں
کچھ اور نکھرنا چاہتا ہوں
گہرائیوں سمندروں کی مانند
میں خود میں اُترنا چاہتا ہوں
اے آبِ حیات تیری خاطر
صحرا میں بکھرنا چاہتا ہوں
ہر ذہن میں روشنی کروں میں
ہر دل سے گزرنا چاہتا ہوں
پہچان رہا ہوں خود کو ایزد
آرام سے مرنا چاہتا ہوں

آفاق کی فضا کا مقدر لگی مجھے
موہوم سی کرن شہ خاور لگی مجھے
جھٹلا سکا نہ اُس کو ستاروں کا یہ ہجوم
زلفِ شب دراز تو اژدر لگی مجھے
ہونٹوں پہ سحر خیز تبسم کے باوجود
اُس آنکھ میں نمی کہ سمندر لگی مجھے
پتے اُٹھا رہی تھی سڑک سے زنِ ضعیف
ذات اُس کی آسماں کے برابر لگی مجھے
نشہ عجب مشاہدہ نو میں ہے نہاں
یہ کائنات مینا و ساغر لگی مجھے
ایزد تشنگیٔ دل و جاں کی نوید تو
وسعت ہوائے صبح میں تخنجر لگی مجھے

اک آگ لگی ہوئی ہوا میں
عجب خشک ہوئی نمی ہوا میں
بارش کی بشارتیں کہاں ہیں
گرمی ہے تنی ہوئی ہوا میں
کیا رنگ بدل رہی ہے جانے
تنہا نہ نکل ابھی ہوا میں
انسان کی سرگزشت اتنی
اک پل میں ہوا ملی ہوا میں
ویرانے میں جاکے سانس لے لیں
دم گھٹتا ہے شہر کی ہوا میں
نغموں سے نہ چھپ سکوں گی ایزد
چیخیں یہ دبی دبی ہوا میں

خوں گلوں کا بہا رہے ہیں بہت
وہ نئے گل کھلا رہے ہیں بہت
دھڑکنوں میں سکت نہیں باقی
سانحے دل ہلا رہے ہیں بہت
دیکھنے میں نہیں کوئی پیکار
تیر بھی سنسنا رہے ہیں بہت
شہرِ غم میں بڑا چراغاں ہے
قہقہے جگا رہے ہیں بہت
جن کے سر پر ہمارا ہاتھ رہا
اب وہی سر اُٹھا رہے ہیں بہت
کھلکھلا کر وہ کیا ہنسے ایزد
آئینے جھلملا رہے ہیں بہت

# ہدایت کاشف/رحیم یار خاں

ہم نے تو بیچے تھے خود سے بھی چھپا کر خال وخد
آشنا اس راز سے پھر آئینہ کیسے ہوا

اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے ادبی مراکز میں مقیم اچھے اور نامور شعرا کی اکثریت کا تعلق مضافات ہی سے ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مضافات یا نسبتاً چھوٹے ادبی مراکز میں رہنے والے شاعروں کو اپنی پہچان کروانے اور اپنے کلام کو متعارف کرنے میں کچھ اضافی مشکلات سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور ہدایت کاشف کا بنیادی مسئلہ بھی یہی ہے۔ وہ طبعی طور پر ایک روایت پسند شاعر ہیں مگر زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے وہ جدید علامتوں، استعاروں، تمثالوں کا کھل کر اور خوبصورت انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے شعری موضوعات بھی بیک وقت ماضی اور مستقبل میں سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ غزل بھی بہت اچھی کہتے ہی ہیں لیکن میرے نزدیک حمد، نعت اور مرثیہ کی شاعری میں نسبتاً زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ میں ان کے لیے دعا گو ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ اپنا تخلیقی عمل جاری رکھیں گے اور یوں ہمیں ان کی بہتر سے بہتر شاعری پڑھنے کا موقع ملتا رہے گا۔ (امجد اسلام امجد)

پھر ہوس کے ہاتھ میں اپنا مقدر دیکھ کر
جھک گیا وہ بار آور پیڑ پتھر دیکھ کر
اس سے پہلے موج تجھ کو لے کے کھو جائے کہیں
موتیوں کو کھوجنا! دریا کے تیور دیکھ کر
کچھ چٹانوں میں چھپے اصنام کے نقش و نگار
خود اُبھر آتے ہیں اکثر دستِ آذر دیکھ کر
وہ تمہارا وار کرنا دوستی کی اوٹ میں
اور مرا پہچان لینا صرف خنجر دیکھ کر
رک گئی تھی سانس آئینے کی کل حیرت کے ساتھ
میرے اندر کے اچانک دکھ کو باہر دیکھ کر
کم ہوئی جاتی ہے کاشف وسعتِ صحرا تو کیا
کب جنوں نے پاؤں پھیلائے ہیں چادر دیکھ کر

اس کا خیال نیند کی گہرائی کھا گیا
یہ رتجگا تو آنکھ کی بینائی کھا گیا
اس کا جمال ہجرتوں کا رزق بن گیا
یہ داغ پورے چاند کی رعنائی کھا گیا
شب بھر بدن کسی کا بہت ٹوٹتا رہا
بے باک آئینہ بھی کیا انگڑائی کھا گیا
رسموں کا دیو پیار کے جذبے نگل گیا
اک آس کو بھی نغمۂ شہنائی کھا گیا
اس دل سے اب تو لذتِ آزار بھی گئی
یہ وقت میرے زخم کی گہرائی کھا گیا
ہنستی ہوئی بہار میں کاشف خزاں کا خوف
ہر اک کلی کی اوٹھتی انگڑائی کھا گیا

پھول کی آغوش میں یہ سانحہ کیسے ہوا
قطرۂ شبنم تھا جو، رزقِ ہوا کیسے ہوا
ابر کے ہاتھوں بسا تھا پل میں جو شہرِ حباب
پل میں ہی دستِ ہوا سے وہ فنا کیسے ہوا
ہم نے تو بیچے تھے خود سے بھی چھپا کر خال وخد
آشنا اس راز سے پھر آئینہ کیسے ہوا

منصفو! کچھ تو کہو یہ فیصلہ کیسے ہوا
قابلِ تعزیر تھا جو بے خطا کیسے ہوا
ڈوبتے سورج کا صدمہ مجھ سے بڑھ کر کس کو تھا
اہتمامِ شامِ غم میرے سوا کیسے ہوا
جس نے سمجھا تھا جدائی کو مقدر کا لکھا
رات اس کا ہر نفس محوِ دعا کیسے ہوا
ایسے تو مقتول جذبوں پر نہیں ہو مطمئن
جانتا ہوں طے تمہی سے خوں بہا کیسے ہوا
مرمریں دہلیز سے زخمی جبینیں ہو گئیں
کیا بتائیں جبر کا سجدہ ادا کیسے ہوا
یہ تعلق آپ کا وہ بھی مرے دشمن کے ساتھ
ایسا کرنا آپ کو کاشف روا کیسے ہوا

عجب کیا ہے کہ چہرے جل رہے ہیں
ہے ایسی دھوپ، سائے جل رہے ہیں
زمانے! تیری رسموں کی چتا میں
وفاؤں کے صحیفے جل رہے ہیں
مرے اندر سمندر موجزن ہیں
اور آنکھوں کے جزیرے جل رہے ہیں
یہ دریا نیند کا یا آگ کا ہے؟
ترے ہاتھوں سے جگنو اڑ رہے ہیں
یا میرے خط کے پرزے جل رہے ہیں؟
کبھی پیاسے تیموں کی اماں تھے
لبِ دریا جو خیمے جل رہے ہیں
خداوندا! کوئی بارانِ رحمت
مری روہی کے "ٹوبھے" جل رہے ہیں
لگائی آگ حاکم نے جو کاشف
اسی میں اس کے پتلے جل رہے ہیں

## سلیمان عبداللہ ڈار/گوجرانوالہ

اے نگہ یار! یہ اعجاز کرم ہے تیرا　　قطرۂ اشک سمندر ہے ترے ہونے سے

ہر حسیں عشق کا منظر ہے ترے ہونے سے
ہر خزاں فصل گل تر ہے ترے ہونے سے
اے نگہ یار! یہ اعجاز کرم ہے تیرا
قطرۂ اشک سمندر ہے ترے ہونے سے
دل کی دنیا میں اُجالا ہے تری یاد کے ساتھ
ذرہ خورشید کا ہم سر ہے ترے ہونے سے
وقت کا جبر و تقاضا تھا بصد ضبط کیا
اب نہ ہونا یہاں بہتر ہے ترے ہونے سے
دو قدم پر جسے منزل کے نشاں ملتے ہیں
وہ مقدر کا سکندر ہے ترے ہونے سے
ہر غمِ زیست تری چاہ میں دم توڑ گیا
اوج پر اپنا مقدر ہے ترے ہونے سے
یہ تغیر در و دیوار میں آیا ہے سلیمانؔ
جو مکاں تھا وہ حسیں گھر ہے ترے ہونے سے

طے کیا ہے جنبشِ لب سے رہیں گے فاصلے
اور دل میں خیمہ زن ہیں درد و غم کے قافلے
ملکۂ ہندوستاں کی قبر سے آئی صدا
"بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے"
دور جانے کے لیے جب دل پہ پتھر رکھ لیا
پھر بھی رستے جو ملے تیری گلی سے جا ملے
جھلملائے ذات بھر جگنو تمہاری یاد کے
درد آنسو بن گئے اک دوسرے سے آ ملے
یہ کرامت کر گئی تیری نگاہِ التفات
دیکھتے ہی دیکھتے سب چاک ہائے دل سلے
خار زارِ عشق جاناں میں قدم رُکتے نہیں
حوصلہ بڑھنے لگا چھلنے لگے جب آبلے
بزم میں تھا ہوش کس کو جام و مینا کا مگر
اُس نظر سے کیف و مستی کے تھے سارے سلسلے

یہ عرش و فرش جو دل میں سمائے جاتے ہیں
تو پھر یہ کس لیے گھر بنائے جاتے ہیں
وہ سر جو جبر کے آگے نہیں جھکتے
وہ سر تو دار کی زینت بنائے جاتے ہیں
تصورات کی دنیا میں وصل کے منظر
نقوش ہائے جدائی مٹائے جاتے ہیں
خراشِ خار کے شکوے زباں پہ ہیں جاری
بہار رُت میں تو غنچے کھلائے جاتے ہیں
سرِ دیارِ طلب بھیک مانگنے والو
نمودِ شوق میں دامن سجائے جاتے ہیں

### انجانا اک خوف

ہاتھ کی ریکھا
میں یہ دیکھا
وصل برابر ہو سکتا ہے
اور ملن بھی ہو سکتا ہے
ہاتھ کی ریکھا میں جو دیکھا
ہو سکتا ہے سچ نہ ہو
ریکھا میں بھی کچھ نہ ہو
پیار کی رہ میں وصل سرائے
آئے نہ آئے
شاید راہ بھی گم ہو جائے

### گریز

یہ تمنا ہے دلِ مضطر کی
اپنے سینے سے لگاؤں اس کو
اور اُسے یہ بھی گوارا کب ہے
بھول کر ہاتھ ملائے مجھ سے

### تصور

رُخصت بذاتِ خود
اتنی بلاخیز
نہیں ہے
جس قدر
اس کا تصور
غارتِ قلب و جگر ہے

### بیوٹی پارلر

مصنوعی پلکیں
ہوتی ہیں بھاری
حیا کے بوجھ سے عاری

# قمر ریاض/مسقط

قمر ریاض مسقط میں مقیم ہیں۔ پاکستان میں اُن کا تعلق علی پور چٹھہ (گوجرانوالہ) سے ہے وہ مکینکل انجینئر ہیں۔ اُن کی نظموں کا مجموعہ "جیون میں اور تتلی" شائع ہو چکا ہے۔ وہ اُردو اور پنجابی شاعری کرنے کے علاوہ افسانے بھی لکھتے ہیں۔ وہ سادہ اور آسان زبان میں شاعری کرتے ہیں لیکن اُن کی نظموں کے مضامین تمام تر سادگی کے باوجود قاری کو سوچنے پر مائل کرتے ہیں۔ وہ پاکستان سوشل کلب عمان لٹریری ونگ کے جنرل سیکرٹری ہیں۔

## جیون میں تتلی

بچپن میں اک تتلی دیکھی تھی
اور چھو لینے کی ضد میں ہم نے
گھر کی دہلیزوں کو پار کیا تھا
آج اس ضد سے ہار گئے ہم
گھر کا رستہ بھول گئے ہم
تتلی کو معلوم نہیں ہے!

## کہانی کی موت

سنتے تھے ہم بچپن میں
اک بڑھیا چاند پہ رہتی ہے
اور چرخہ کاتی رہتی ہے
سنتے ہیں اب لوگوں سے ہم
ایک انسان نے چاند پہ جا کر
اس بڑھیا کو مار دیا ہے.....

## گہرا دُکھ

شب بھر سوچا
اور کاغذ پر
لکھا کچھ بھی نہیں
بس اتنا ہی میں نے دیکھا
کاغذ بھیگ چکا تھا.....!

## کوئی تو چیز لوٹا دو

جداگانہ سے رستوں پر
اگر تم چل ہی نکلے ہو
تو پھر ٹھہرو
ابھی کچھ تم سے کہنا ہے
وہی لمحے جو خوشیوں کے تمہارے نام کر ڈالے
وہی موسم کہ چاہت کے جو تم پر وار کر ڈالے
وہی جگنو جنھیں ہم نے
تمہارے نام سے پکڑا
وہی تتلی
تمہارے نام پر میں نے جسے چھوڑا
کوئی تو چیز لوٹا دو
جداگانہ سے رستوں پر
اگر تم چل ہی نکلے ہو
تو پھر ٹھہرو!

## اتنا کیوں ڈرتے ہو؟

اک پرائی آگ میں
ہر گھڑی ہی جلتے ہو
زندگی پہ مرتے ہو
بے مراد خواہش کے
کھونے سے بھی ڈرتے ہو
بے یقین منزل کو.....
بے ارادہ چلتے ہو
خواہشیں تو سب کی ہیں
منزلیں تو سب کی ہیں
کون ان کو پاتا ہے
پھر مرہوتی خواہش کا
روگ کیوں لگاتے ہو؟
بے یقین منزل کا کھوج کیوں لگاتے ہو؟
پل میں بجھتی پلکوں پر
خواب کیوں سجاتے ہو؟
خواب تو کبھی کے ہیں
خواب کے جزیروں پر
عذاب کیوں اُگاتے ہو؟
درد کی فصیلوں پر نقش کیوں بناتے ہو؟
درد پال لیتے ہو
خود کو مار لیتے ہو
رنج و غم اُگا کر تم
بے مراد خواہش کے
کھونے سے بھی ڈرتے ہو
جس کو پا نہیں سکتے
پھر اسی پہ مرتے ہو
پھر مرہوتی خواہش کا
روگ کیوں لگاتے ہو
خواب کیوں سجاتے ہو؟

# احمد علی کیف / بہاولنگر

میں کس مسافتِ صد چاک کا گریباں ہوں
کہ سنگِ میل تو بخیہ دکھائی دیتا ہے

مہکی سی خواب رُو نظر، قصّہ بھی دید ناک ہے
گزرا ہے کاروانِ شب، روئے فلک پہ خاک ہے
ہجر قلاشِ نظریہ، یادِ نمازِ فجر ہے
خوابِ جلالِ اشک خُو، قریۂ غم تپاک ہے
آنسو تکلّفات کے، عارضِ دُنیا زار پہ
وجہِ عنایتِ نمو، ایک نظر بہ خاک ہے
راج کُماری رو پڑی، اپنے خُدا کے سامنے
میری تمنّا خُو بُری، تیری دروں تو پاک ہے
کیسا وُجودِ ناز ہے، ڈھونڈے ستارہ لَس کو
فرشِ دَرُوں میں غرق ہوں، عرشِ فزوں پہ تاک ہے
چہرہ صبائے سادگی، چشمِ وضو ہے روبرو
یعنی بدن سنوَر ہے، ریشم بہ تَن فراک ہے
گلیوں میں گرد ہو رہے، سانسوں کی گانٹھ ڈھو رہے
گارا ہے اسمِ کیفؔ کا شعروں کا ڈھالے چاک ہے

ہم اشک بچھاتے ہیں، پلکوں کے سہارے سے
نیندوں کی اُمنگ ایسے جھرنوں کے نظارے سے
سردی میں گلابوں سا، اک پودا اُگایا تھا
دامن کی زماں گردی، پُر خواب ستارے سے
اُلجھن میں کھڑی آنکھیں ہاتھوں پہ رکھے منظر
نظروں کی سلائی ہے دُوری کے پکارے سے
دیوار مژہ حاضر لفظوں کے بہاؤ کو
نم بستہ درونِ دل اک ہجر کے گارے سے
اُس چاند کی رونق ہے، اِس رات کے آنگن سے
سورج کی تپش تاباں رُخسار تمھارے سے

اب خوش قدموں سے نہیں بہلاؤں مزاج اپنا
کب چہرہ نکھرتا ہے آئینہ سنوارے سے
اُمیدِ شناسائی، یک لحظہ نہ راس آئی
بے زخمِ ترنگ ایسی اِک بُوند سہارے سے
ہم کیفؔ بہاروں کی کُرسی پہ بٹھا آئے
آنکھوں کی سُخن پوشی، کچھ خواب کہ پیارے سے

اُنھی لفظوں، اُنھی نظموں، اُنھی شعروں، کتابوں سے
تری صورت نمایاں ہے مرے اِن کچھ درختوں سے
جو ہیں خالی جہاں، جہاں خالی، سُخن بے کار و بے تاثیر
نظر چہرے پہ کوئی ہو، ادھوری بات حرفوں سے
پلک بھر ڈھونڈتے مجھ کو، کہیں تو پوچھتے میرا
زمیں قائم نہیں ہے صرف اِن اونچے پہاڑوں سے
محبت ناک لمحوں میں کسی لڑکی پہ آجانا
دلِ واماندگاں کا اور حسرت کیش بانہوں سے
تجھے پربت اذیّت کے ہی سر کرنا بس آتے ہیں
کبھی لپٹے ہو تم الفت زدہ بستر کی شاخوں سے
کسی نگلیں بلندی کو مہِ دلدار دیکھے ہے
کسی زلفام اُفق پر وہ، شفق بر شوخ ہونٹوں سے
مری دیوار عریاں ہے، مرا گھر ڈھانپتی کیسے
نگاہوں کو چُرا بیٹھا میں گلیوں سے، مَیں لوگوں سے
مریضِ بسترِ نازک، وفدِ اُمیدِ فرصت ہے
حکومت لوٹتی خاروں، وہ اُلجھے ہیں گلابوں سے
قمیصیں کاٹتیں جسمِ برہنہ کی عقیدت کو
تجھے جب سے گنوایا ہے تلاشیں ہیں ستاروں سے

زہے وصال وہ چہرہ دکھائی دیتا ہے
مرا خدا مری دنیا دکھائی دیتا ہے
ابھی ابھی مرے رخسار سے وہ آیا ہے
ملن کنارہ ہے، بہتا دکھائی دیتا ہے
بصد خلوص تراشہ ہے اس مجسّم کو
مرا فرشتہ بھی "چہرہ دکھائی" دیتا ہے
مَیں کس مسافتِ صد چاک کا گریباں ہوں
کہ سنگِ میل تو سپنا دکھائی دیتا ہے
گُشاد و کشف کی دنیا بھی خوبصورت ہے
لگے جو آنکھ تو سپنہ دکھائی دیتا ہے
جلے وجود کی گلیاں ترے مناسب ہیں؟
شعاعِ نم سے کنارہ دکھائی دیتا ہے

کلیوں بھرے شجر پہ گُلِ نم نہیں کھلا
مرجھا گئی ندی، لبِ موسم نہیں کھلا
صدیوں کے اشک جذب گلابوں کے وصل میں
بادِ نوائے ہجر میں اِک دم نہیں کھلا
بیلیں خزاں کے درد کی پھیلی ہیں کوبکو
زخمِ بہارِ ابر پہ مرہم نہیں کھلا
خاکستری حجاب سے اُلجھی ہے چشمِ خواب
رُخسارِ حُسن خیز پہ شبنم نہیں کھلا
جسمِ سیاہ بھی مرا پھیلا ہے انتہا
حیرت ہے تیرا زہر بھی کچھ کم نہیں کھلا
جلنے لگی سحر میں کھلی نیند دل بہ کیف
یعنی جبیں پہ زُلف کا وہ خم نہیں کھلا
بستی درونِ دل کی ہے ویران آج تک
حسرت کہیں پہ کیفؔ کہیں غم نہیں کھلا

# محمد عدنان خالد/میلسی

یہ ایک بات سمجھنے میں عمر بیت گئی
وصال صرف ملاقات سے نہیں ہوتا

---

پیشتر اس سے کوئی اشک بہانے لگ جائے
تم سمندر سے کہو خاک اُڑانے لگ جائے
نقش گر ایسا کوئی نقش اُتار آنکھوں میں
ہجر تصویر سے باہر نظر آنے لگ جائے
اُس سے کہہ دوں گا نہیں اُس کی ضرورت مجھکو
اس سے پہلے کہ وہ خود ہاتھ چھڑانے لگ جائے
عین ممکن ہے مرا دل بھی تری دنیا میں
اپنی خاطر نہ سہی، تیرے بہانے لگ جائے
یہ تو اچھا ہے کہ تجھ ایسا نہیں ہے کوئی
کوئی ہوتا بھی تو کہتے کہ ٹھکانے لگ جائے

---

ہم اہلِ عشق وفا کے معانی جانتے ہیں
سو تیرا ہجر بھی تیری نشانی جانتے ہیں
تری کہانی میں کردار ہم نہیں لیکن
تری کہانی بھی اپنی کہانی جانتے ہیں
اُسے کہو تری دنیا تجھے مبارک ہو
ہم ایک اور بھی دنیا بسانی جانتے ہیں
ترے مزاج میں حُسنِ تضاد کتنا ہے
اے خوش گمان، تری خوش گمانی جانتے ہیں
کسی کے حال سے کیسے ہوں باخبر عدنان
ہم اپنا حال بھی اُن کی زبانی جانتے ہیں

---

فرصتِ عشق میسر نہ تقاضا ہے مجھے
عمر دو روزہ ملی ہے، اسے جینا ہے مجھے

---

تُو نے کن نظروں سے دیکھا مرا اُجڑا ہوا روپ
آئینہ دیر تلک دیکھتا رہتا ہے مجھے
نام لے سکتا ہوں اُس کا مجھے حق حاصل ہے
اُس نے یہ حق بھی بڑی دیر میں بخشا ہے مجھے
اب تو جینے کی تمنا بھی مری مر گئی ہے
پھر بھی زندہ ہوں کہ تُو زندہ سمجھتا ہے مجھے
ایک ہی جسم میں دو شخص بھی ہو سکتے ہیں
خود پہ عدنان کسی اور کا دھوکہ ہے مجھے

---

مت سمجھیے گا کہ ہم لوگ ڈرے بیٹھے ہیں
دنیا ہم سے نہیں، ہم اس سے پرے بیٹھے ہیں
تم پشیمان ہو کیونکر، کہ جب اے جانِ وفا
ہم تو الزام ہی قسمت پہ دھرے بیٹھے ہیں
جس بُتِ شوخ نے چھینی ہیں ہماری نیندیں
اُس بُتِ شوخ کی آنکھوں پہ مرے بیٹھے ہیں
اُن کی خاموشی کو کمزوری نہیں جان اُن کی
چُپ ہیں جو لوگ وہ اندر سے بھرے بیٹھے ہیں
اور تو عشق میں کچھ کر نہیں پائے ہم لوگ
جتنا ہو سکتا تھا نقصان، کرے بیٹھے ہیں

---

ہجر بخشا، نہ کوئی وصل کی ساعت بخشی
تونے اے دوست مجھے کیسی محبت بخشی
مجھے ڈر تھا کہ مرا جھوٹ نہ پکڑا جائے
اسی ڈر نے مجھے سچ کہنے کی جرات بخشی
میں کہاں ایسا کہ مجنوں کے مقابل آتا
یہ ترا عشق ہے جس نے مجھے عزت بخشی

---

ماں کے قدموں میں گزرتے ہیں شب و روز مرے
اسی دنیا میں خدا نے مجھے جنت بخشی
شعر کہنا تو مرے بس میں نہیں تھا عدنان
شعر کہنے کی مجھے رب نے سعادت بخشی

---

نہیں کہ ہجر کے صدمات سے نہیں ہوتا
ملال اب تو کسی بات سے نہیں ہوتا
تری زبان کی تلوار سے ہُوا مرا قتل
یہ کام ورنہ ترے ہاتھ سے نہیں ہوتا
میں صاف بچ کے نکل جاتا عین ممکن تھا
اگر یہ عشق شروعات سے نہیں ہوتا
یہ ایک بات سمجھنے میں عمر بیت گئی
وصال صرف ملاقات سے نہیں ہوتا

---

ہمارے اشک رواں دیکھ اور چارا کر
اے بے کنار سمندر کہیں کنارا کر
جمالِ یار مجھے تُو ہی کوئی راہ دکھا
جنابِ عشق یہ کہتے ہیں کچھ خسارا کر
میں آج رات بھی بستر بچھا کے بیٹھا ہوں
اگرچہ نیند یہ کہتی ہے مت پکارا کر
تمام دن کی مشقت تمام ہوتے ہی
غمِ جہاں نے کہا جا، وہی دوبارا کر
مرے علاوہ تری اور کون سُنتا ہے
مرے علاوہ کسی کو بھی مت پکارا کر
تجھے پتہ ہے، تجھے صرف میں سراہتا ہوں
سو آئینے مری نقلیں نہیں اُتارا کر

## عمر شاہد/خانیوال

کبھی خوشبو تو کبھی خواب میں ڈھل کر دنیا
روز ملتی ہے مجھے بھیس بدل کر دُنیا

---

ایک کنکر کے کھڑا ہے یہ سہارے پتھر
پھر بھی کرتا ہے سمندر کو اشارے پتھر
خوش نصیبی ہے خدا جس کو فراست دے دے
کور چشموں کو تو یکساں ہیں ستارے پتھر
تھک گیا ہوں میں تجھے اپنی کہانی کہتے
اب کوئی بات مجھے تو بھی سنا رے پتھر
مندروں والے کہیں اور مکیں ہیں اب تو
دل ٹٹولو گے تو مل جائیں گے سارے پتھر
پیڑ مجبور ہے سایہ یا ثمر ہی دے گا
پاس آئے یا کوئی دور سے مارے پتھر
اپنے منہ زور خیالات کو ترتیب دیا
جیسے تیسے بھی کیا میں نے سدھارے پتھر
لوگ ہیروں کی تجارت میں ہیں غلطاں شاہد
اور میں جھولی میں لیے پھرتا ہوں سارے پتھر

---

شعلۂ کرب سے تحلیل بھی ہو سکتا ہے
دل کسی دشت کی تمثیل بھی ہو سکتا ہے
کر کے مسمار میں اپنا یہ جہاں سوچتا ہوں
اک جہاں اور کیا تشکیل بھی ہو سکتا ہے
محفلِ جام و سبو ان کی حقیقت کیا ہے؟
جب نشہ آنکھ سے ترسیل بھی ہو سکتا ہے
لب و رُخسار سے اُلفت ہو ضروری تو نہیں
باعثِ لطف کوئی تل بھی ہو سکتا ہے
وہ جو سپنوں کا محل کب سے ادھورا ہے مرا
اک ترے آنے سے تکمیل بھی ہو سکتا ہے
خشک آنکھوں سے جو اک دشت نظر آتا ہے
دیدۂ تر ہو تو یہ جھیل بھی ہو سکتا ہے

---

کبھی خوشبو تو کبھی خار میں ڈھل کر دنیا
روز ملتی ہے مجھے بھیس بدل کر دنیا
اس کو درویش کے حجرے میں کہاں ڈھونڈتے ہو
یونہی دو چار قدم پر ہے نکل کر دنیا
ہم خرابوں کے گھروں تک ہے سفر پتھر کا
تجھ کو آنا بھی پڑے دیکھ سنبھل کر دنیا
شوق تیرا بھی سلامت تو سفر میرا بھی
مجھ کو دو چار قدم چھوڑ دے چل کر دنیا
تو مرے ساتھ جو ہوتا ہے تو مجبوری میں
مجھ سے ملتی تو ہے لیکن بڑی جل کر دنیا
سب محبت سے پلاتے ہیں اُسے دودھ کے گھونٹ
آستینوں میں جواں ہوتی ہے پل کر دنیا

---

میرے سانسوں کے اُلجھنے کی خبر تک رہتی
یہ لڑائی تو مرے رختِ سفر تک رہتی
اب تو گلشن میں ہیں ماتم کی صدائیں ہر سو
کاش وہ بیل کسی ایک شجر تک رہتی
عشق کے جام سے گریہ نہ معطر ہوتے
میرے سجدوں کی رسائی میرے سر تک رہتی
کوئی پابند محبت کو بھلا کیسے کرے
کیا یہ ممکن تھا نظر ایک نظر تک رہتی
گر فلک پر یہ ستارے نہ سجائے جاتے
وسعتِ فکر تو پھر ایک قمر تک رہتی

---

طاق نسیاں پہ دھر دیا صاحب
ہم نے کیا ایسا کر دیا صاحب
اک ذرا نعمتِ درد مانگی تھی
میرا دامن ہی بھر دیا صاحب
یہ ہوائیں وہی چلاتا ہے
جس نے اڑنے کو پر دیا صاحب
ایک دنیا نئی کھلی مجھ پر
جونہی طوفاں میں سر دیا صاحب
آپ نے جب وفا کا ذکر کیا
سب کو حیران کر دیا صاحب

---


شاہد علی خاں کی زیرادارت
شائع ہونے والا اُردو کا منفرد اور
معتبر جریدہ
"الحمراء"
شائع ہو گیا ہے
اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
یا براہِ راست منگوائیں
0333-4001844

# عقیل شافی / لاہور

اپنی آنکھوں میں نت نئے خوابوں کے رنگ
تیری یادوں کے سہارے عمر بھر چلتا رہا

اس کا گرچہ شور بہت ہے
انساں پر کمزور بہت ہے
بندے شہروں میں ہی ٹھہریں
جنگل میں اک مور بہت ہے
شاید آج پتنگ کٹے گی
لمبی اس کی ڈور بہت ہے
دنیا نے بھی حد کر دی ہے
خالق میں پر زور بہت ہے
بیٹھ کر مٹی پر ہم سمجھیں
دور یہاں سے گور بہت ہے
دل کا جانا ٹھہر نہ جائے
ظالم اس کی ٹور بہت ہے
پہلے تھا وہ یار ہمارا
اک جو لگتا بور بہت ہے
کوئی شافی کو سمجھائے
تختہ میری اور بہت ہے

---

نگری نگری شام سویرے
پھرتے ہیں دیوانے تیرے
موسم نے بھی کروٹ لی ہے
جب آئے وہ زلف بکھیرے
تارے تیری راہ گزر ہیں
میرے رستے گھور اندھیرے

---

میرا کوئی نام نہیں ہے
تیری شہرت ڈیرے ڈیرے
شافی ہم نے بھی گلشن میں
اپنے خون کے رنگ بکھیرے

---

ظلم کی رات ڈھلنے والی ہے
اک نئی صبح اُترنے والی ہے
تم نے دیکھا تو یہ یقین ہوا
اب طبیعت سنبھلنے والی ہے
چاند اُترا ہے میرے آنگن میں
اب ہوا بھی تو چلنے والی ہے
مجھ کو وجدان یہ ہوا شافی
میری قسمت بدلنے والی ہے

---

یہ آرزو ہے کہ یوں زندگی گزاروں میں
ترے شعور کو احساس میں اُتاروں میں
وہ لمحہ لمحہ اُلجھتا ہے ڈور کی مانند
یہ سوچتا ہوں کہ کیسے اُسے سنواروں میں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ پیاس کیسے بجھے
اب اپنی ذات کے دریا کو ہی پکاروں میں
نہیں ہے خواب کوئی اب مری نگاہوں میں
ہر ایک سانس یاد میں گزاروں میں

---

وہ میرے عشق کا حاصل تو تھا مگر شافی
جنوں یہ ہے کہ اُسے جیت کر ہی ہاروں میں

---

تو کہ جب سے پیکر انوار میں ڈھلتا رہا
میرا دل بھی آتش حالات میں جلتا رہا
اپنی آنکھوں میں بسائے نت نئے خوابوں کے رنگ
تیری یادوں کے سہارے عمر بھر چلتا رہا
جس نے بھولے سے کبھی مجھ کو پکارا ہی نہیں
اُس کی یادوں کا دیا دل میں مرے جلتا رہا
جانتا تھا جب حقیقت بھی عیاں ہو جائے گی
پی کے ساغر کیوں کف افسوس وہ ملتا رہا
سائے کی اُمید میں شافی رہا ہوں عمر بھر
جانے کیوں میری تمنا کا شجر جلتا رہا

---

وفا کر گیا یا جفا کر گیا
وہ جیون کی قسطیں ادا کر گیا
مسیحا سمجھتا تھا اُس کو مگر
مرا زخم وہ لا دوا کر گیا
ذرا دور سے جو دکھائی دیا
مرے دل میں آخر جگہ کر گیا

# ادبی خبریں/تقریبات

## بدر سیماب اور ارشد نذیر ساحل کے اعزاز میں محفل مشاعرہ

(رپورٹ: ناز اوکاڑوی) گزشتہ دنوں کویت سے آئے ہوئے بدر سیماب، بارسلونا سے تشریف لائے ہوئے ارشد نذیر ساحل کے اعزاز میں اور مرحوم شاعر خالد احمد کی یاد میں "اعتراف انٹرنیشنل" کے زیر اہتمام ایک بھرپور شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت معروف شاعر خالد شریف نے کی۔ مہمان خصوصی نصرت صدیقی (فیصل آباد)، مہمانانِ اعزاز نجیب احمد، بدر سیماب (کویت)، ارشد نذیر ساحل (اسپین)، ریاض ندیم نیازی (سبّی) اور خالد سجاد (کویت) تھے جس میں کثیر تعداد میں شعراء اور سامعین کی شرکت نے مشاعرے کو کامیاب کیا۔ تقریب کے آغاز میں چیئرمین "اعتراف انٹرنیشنل" حسن عباسی نے معزز مہمانوں اور سامعین کو خوش آمدید کہا۔ مشاعرے کی نظامت نواز کھرل نے نہایت خوبصورت انداز میں کی۔ جن شعراء نے اپنے خوبصورت کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اُن کے اسماء گرام کچھ یوں ہیں:

خالد شریف، نجیب احمد، بدر سیماب، ارشد نذیر ساحل، ریاض ندیم نیازی، خالد سجاد، اسلام عزمی، شفیق سلیمی، زاہد مسعود، خلش بجنوری، گلزار بخاری، علی اصغر عباس، ممتاز راشد، اعجاز کنور راجہ، عباس تابش، ریاض رومانی، غافر شہزاد، حسنین سحر، کنور امتیاز احمد، زاہد ہما، علی رضا، حسن عباسی، سعید عاصم، شاہد ماکلی، اظہر عباس، سہیل عباس، منصور فائز، ازل حسین، نیازت علی نیاز، محمد ایاز، ملک طارق جاوید، شمس رانا، اشرف نقوی، سہیل یار، ڈاکٹر اخلاق گیلانی، عقیل اختر، فاطمہ غزل، ناز اوکاڑوی، فراست بخاری، حافظ احسان الحق، سلطان محمود، شہزاد ملک۔

## ماہانہ مشاعرہ گلشن ادب

(رپورٹ: عاشق رحیل) پچھلے ہفتہ معروف ادبی شخصیت جناب عاشق رحیل کی رہائش گاہ پر ایک محفل مشاعرہ انعقاد پذیر ہوا۔ جس کی صدارت جناب گلزار بخاری نے کی اور مہمان خصوصی رانا اظہر فیروز تھے۔ جن شعراء نے اس مشاعرہ میں حصہ لیا اُن کے اسمائے گرام یہ ہیں۔ گلزار بخاری، رانا اظہر فیروز۔ ڈاکٹر محمد یونس احقر، پروفیسر عاشق رحیل، اقبال راہی، میجر اعظم کمال، پروفیسر محمد عباس مرزا، پروفیسر محمد رمضان شاکر، محمد ابرار، عاصم خواجہ، ہمایوں پرویز شاہد، ڈاکٹر طاہر شبیر، فضل حق گلشن، ظہیر احمد ظہیر، کامران عاشط، ایم آر مرزا، محمد امین ایمی، عطاالعزیز، ڈاکٹر محمد ابرار، عقیل شافی، شاہد روحانی، سید فراست بخاری، پرویز اعرابی، شاہد عباسی، حاجی عبداللطیف کھوکھر، ساجد پریمی، رانا محمد اکرم، حافظ مسعودالرحمٰن، محمد عثمان محمود، سہیل یار، سردار نسیم احمد، خواجہ ذاکر، میجر خالد النصر، خالد خورشید اور بابا جی مشاعرے کے اختتام پر خورد و نوش کا اہتمام بھی کیا گیا۔

## معروف شاعر مسعود احمد کو صدمہ

(رپورٹ: احمد جلیل) پچھلے دنوں معروف شاعر مسعود احمد کے جواں سال بھائی ہمایوں شہزاد ایک حادثے میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

اُس ناگہانی سانحہ ارتحال پر افضل خان کا یہ شعر بے طرح یاد آتا ہے:

کہانی میں کوئی رد و بدل کر
مرا مرنا ابھی بنتا نہیں ہے

مرحوم بے پناہ صلاحیتوں کے مالک، اچھے وکیل اور خوبصورت شاعر تھے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

## ریاض ندیم نیازی کے لیے ریشم ادبی ایوارڈ

معروف شاعر و ادیب و صحافی ریاض ندیم نیازی کو علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ریشم ڈائجسٹ کی جانب سے نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی اسلام آباد (این ڈی یو) کے آڈیٹوریم میں ہونے والی پروقار ادبی تقریب میں ریشم ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ واضح رہے کہ ریاض ندیم نیازی کے تین نعتیہ مجموعے "خوشبو تری جوئے کرم"، "ہوئے جو حاضر در نبی پر" اور "بحر تجلیات" جبکہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل اوّلین شعری مجموعہ "تمہیں اپنا بنانا ہے" لاہور کے ایک معروف اشاعتی ادارے سے شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

## ادارہ شعور رجسٹرڈ اوکاڑہ کے زیر اہتمام تقریب جشن بہاراں

(رپورٹ: احمد جلیل) پچھلے دنوں ادارہ شعور رجسٹرڈ اوکاڑہ کے زیر اہتمام تقریب جشن بہاراں کا انعقاد ڈاکٹر شمیم الحق کی رہائش گاہ پر ہوا۔ پھولوں سے محبت کرنے والے بے شمار لوگوں نے اس میں شرکت کی۔ مختلف خوبصورت پھولوں کی کیاریاں، پلانٹس اور لان دلفریب منظر پیش کر رہے تھے۔ شرکاء نے ان پھولوں کو جی بھر کر دیکھا اور ان کی خوشبو سے مشامِ جاں کو معطر کیا۔ بعدازاں جملہ شرکاء ڈرائنگ روم میں تشریف لے گئے جہاں رنگ برنگے پھولوں کے گلدستے ان کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے۔ اس تقریب کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے ماضی کی معروف گلوکارہ نسیم بیگم کے دلفریب نغموں کی محفل سجا کر انہیں خراج تحسین پیش کرنے کا اہتمام بھی تھا۔

ڈاکٹر شمیم الحق، پروفیسر ریاض خان اور احمد جلیل نے نسیم بیگم کے فن اور شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی جسے سامعین نے خوب سراہا۔ جب نسیم بیگم کے گائے ہوئے نغموں کی مہکار بکھری تو سامعین مسحور ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے یوں لگا کہ جیسے ماضی لوٹ آیا ہو۔ بقول شاعر:

وہ مل جائے تو پھر لگتا ہے ایسے
زمانہ لوٹ آنا چاہتا ہے

اس طرح یہ خوبصورت تقریب اگلے سال پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئی۔ آخر میں شرکاء کی پرتکلف چائے سے تواضع کی گئی۔

## کل پاکستان محفل مشاعرہ

(رپورٹ: مامون طاہر رانا) سوشل ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن، ورسٹائل آرٹ پروموشن اینڈ ویلفیئر آرگنائزیشن کے اشتراک سے کل پاکستان محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ تقریب ہذا میں پاکستان بھر سے شعراء کرام شریک ہوئے۔ صدارت معروف شاعر و دانشور اعتبار ساجد نے کی جبکہ مہمانانِ خصوصیوں میں ڈاکٹر حیات اعوان، مخدوم غلام یزدانی گیلانی، احمد مجتبیٰ گیلانی، وسیم ممتاز ایڈووکیٹ، ملک جہانزیب وارن، مخدوم زوہیب گیلانی، رانا فراز احمد نون، خواجہ محمد عثمان، عمران اعظمی، میاں زاہد گردیزی، پروفیسر حمید رضا صدیقی، اعظم خاکوانی، اکرام عارفی شامل تھے۔

اس موقعہ پر کلام پیش کرنے والوں میں اعتبار ساجد (لاہور)، کوئٹہ سے معین اختر نقوی، وسیم ممتاز ایڈووکیٹ، ڈاکٹر شوذب کاظمی، ریاض شاہد چنیاں (کبیر والا)، میڈم کوثر اعجاز چوہدری (قصور)، سرگودھا سے اسد اعوان، تنویر سیٹھی (وہاڑی)، عدنان آصف (پاک پتن)، فیصل مرزا (رحیم یار خان)، رضی الدین رضی، اجمل خاموش، ضیاء ثاقب بخاری، قمر قتال پوری (قتال پور)، تحسین غنی، رہبر صمدانی، نبیل طور، ارشد عباس ذکی، رائے ظفر اقبال، داؤد حید اسد، مامون طاہر رانا، خرم خرام صدیقی (اسلام آباد)، ڈاکٹر ندیم اکبر (وہاڑی)، طارق جاوید (کبیر والا)، اکرام عارفی (لاہور)، حکیم سید زاہد وصی زیدی (لاہور)، علی حسن جاوید (میلسی)، اعجاز رشید (میلسی)، انمول گوہر، شمشاد کوثری، ماہ رانی ضیغم، خالدہ شفق رانا، منور آکاش، عمرانہ کومل، منور خورشید صدیقی، شازیہ خان (مظفر گڑھ)، خالد سعید قلندری شامل تھے۔ جبکہ اس موقعہ پر شرکت کرنے والوں میں عامر نقشبندی، آصف اعوان، عیسیٰ بھٹہ، فرح رحمٰن، شازیہ ابرار، شفیق اختر، شہزاد احمد، رابعہ ساغر ایڈووکیٹ، پروفیسر اقبال شاہ، سجاد ملک، نور امین خاکوانی، محمد عاصم سعید، محمد اختر، محمد حسن شاہ، ایم ایم ادیب، ابوبکر ہاشمی، شفیق بھٹی، رہنواز بھٹہ، اعجاز، میاں عاصم، خواجہ محمد انس، محمد عاصم سعید شیخ، سید حسن جمالی، محمد ذکی، فرہاد صدیقی، راؤ آصف، احمد فراز بچہ، ملک منصور اعوان، ارسلان احمد، حسن رضا، نایاب فاطمہ، ساجد اعوان، عبدالباسط، شاہد حسن صدیقی، لبنیٰ کنول، آسیہ امام، عمر فاروق، ہمایوں سلیم، محمد راشد و دیگر شریک تھے۔ اس موقعہ پر نظامت کے فرائض راقم الحروف، منور خورشید صدیقی، نے ادا کیے جبکہ تلاوت و نعت کی سعادت فہیم ساجد نے حاصل کی۔

## بزم حشمت کا سالانہ مشاعرہ

بزمِ حشمت کا سالانہ مشاعرہ حشمت اسکول سسٹم شاہدرہ کے ہال میں مورخہ 21 جون رات آٹھ بجے منعقد ہوا۔ مشاعرے کا آغاز تلاوت کلامِ پاک سے ہوا۔ اس کے بعد احسان نے اپنی خوبصورت آواز میں نعت پڑھ کر محفل کو بقعۂ نور بنا دیا۔ مشاعرے کی صدارت معروف شاعر سلیم کورمانی نے کی۔ مہمان خصوصی ممتاز شاعر اور ماہنامہ ارژنگ کے مدیر حسن عباسی تھے۔ جبکہ مہمان اعزاز نوجوان نسل کے مقبول شاعر رحمان فارس تھے۔ اس کے علاوہ لاہور سے ڈاکٹر عمران اور مراد فیضی نے بطور خاص شرکت کی۔ اس تقریب میں شعرائے شاہدرہ کے علاوہ مختلف شہروں سے شعراء تشریف لاتے تھے۔ سامعین نے شعرائے کرام کو ہر اچھے شعر پر دل کھول کر داد دی۔ مشاعرے کے بعد ڈنر کا اہتمام بھی کیا گیا۔

# تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

فیض کی شاعری میں پنجاب رنگ/مرتب: ڈاکٹر اصغر علی بلوچ/صفحات 128 / قیمت 200 روپے/فلیپ نگار: ڈاکٹر انوار احمد

---

ناشر: مثال پبلشرز، فیصل آباد

---

اقبالؔ کے بعد فیض ہمارے عہد کی سب سے معتبر آواز ہے۔ اقبالؔ اور فیض میں جو فکری، زمانی اور مکانی نسبتیں ہیں وہ عیاں ہیں۔ ان شعرا کی عظمت مسلم ہے۔ تاہم ایک وقت تھا جب ''نیاز مندانِ پنجاب'' کو بعض پھبتیوں کا جواب دینا پڑتا تھا۔ پر اب وہ اعتراض اور معترض گردِ زمانہ کی نذر ہوئے۔ پنجابی زبان ایک میٹھی اور دلکش زبان ہے جس کا لحن عوامی امانت ہے اور فیض کی عربی، فارسی اور انگریزی دانی اپنی جگہ مگر ان کے مزاج کی خاک نشینی اور بردباری کے ساتھ ساتھ ان کی فکر و فکر اور ان کی تخلیقی زندگی کے زرخیز ادوار میں پنجاب کی مٹی کی بوباس صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر اصغر علی بلوچ نے ''فیض کی شاعری میں پنجاب رنگ'' کے موضوع پر دادِ تحقیق دی ہے اور اس پر وہ خود بھی داد کے مستحق ہیں۔ مصنف نے فیض کی پنجابی شاعری کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور اس غواصی یا کشیدِ دل کے بعد جو متاع ان کے ہاتھ لگی وہ فیض کی اس تلقین کے ساتھ ان کے مداحوں کی نذر کر رہے ہیں: ؎ ہو کہ مفت لگادی ہے، خونِ دل کی کشید

---

پیاری اماں/انتخاب: اسلم گمان/صفحات 128 /تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

---

ناشر: سبحان پبلی کیشن 1/ 362 -E مین بازار حسنین آباد، لاہور کینٹ

---

مجموعہ ''پیاری اماں'' مائیں تو ہمیشہ پیاری رہی ہیں۔ ماؤں کے ممتا اور دوسری خوبیوں کا تذکرہ نبیوں اور احادیث سے بھی ثابت ہے۔ اپنی گوناگوں ممتا بھری صفات سے جنت کی بھی حقدار ٹھہری ہیں۔ ماں جیسی عظیم ہستی کے لیے ازل سے لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ حال ہی میں سعودیہ میں مقیم نوجوان شاعر اسلم گمان نے ماں کے حوالے سے معروف شعراء کا کلام ایک جگہ اکٹھا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اسلم گمان کا یہ مجموعہ یقیناً ہر فرد کو پسند آئے گا۔

---

نام کتاب: جگنو وچ ہنیرے/شاعر: عقیل شافی/صفحات 128 / قیمت 200 روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

---

ناشر: گلشن ادب، لاہور

---

''جگنو وچ ہنیرے'' عقیل شافی ہوراں دا پہلا غزلی پراگا اے۔ عقیل شافی پنجابی دے جانے پچھانے شاعر نیں۔ شافی ہوراں نعت، حمد، منقبت توں بعد غزلاں دا پوربنا سجا کے ساڈے ویہڑے آ سجایا اے۔ دل نوں موہ لین والی شاعری اپنا رنگ تے اپنا سبھاولاں تے رنگ جماوندی نظر آوندی اے۔

عقیل شانی ہوراں جو کچھ آکھیں ویکھیا ہڈیں ورتیا کھل کے بیان کردتا اے۔ میں اس خوبصورت مجموعے دے چھپن تے ادبی حلقیاں چ پسند کرن دی دُعا کردناں آں۔ اللہ ایہدے قلم نوں ہور لکھن دی توفیق دیوے۔ آمین

---

نام کتاب: چورلمحہ/مصنف: روحی طاہر/صفحات 144 / قیمت 400روپے/فلیپ نگار: خالد شریف

---

ناشر: ماورا پبلشرز، لاہور

---

ہماری خواتین ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے بارے میں ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ وہ دھوئیں کے مرغولے اُڑاتے ہیرو اور درختوں کے گرد ناچتی ہیروئن سے آگے نہیں نکلتیں۔ آج کل ہمارے چینلز پر جو ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں وہ بھی کم و بیش اسی ڈگر کے ہیں لیکن زندگی کے اصل مراحل و مصائب ''چیزے دیگر'' ہیں۔ لکھنے والا اگر خود اس بھٹی میں تپ کر کندن بننے کے بعد قلم تھامے تو وہ ایسی کہانیاں تخلیق کرتا ہے جیسے روحی طاہر نے ''چورلمحہ'' میں کی ہیں۔ یہ ساری کیفیت انہوں نے اپنے جسم و جاں پر جھیل کر اُسے الفاظ کا پیراہن دیا ہے۔

---

نام کتاب: اندر آنا منع ہے/مصنف: ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/صفحات 172 / قیمت 250روپے/فلیپ نگار: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

---

ناشر: خزینہ علم و ادب، لاہور

---

اُن کے ان مختصر تاثراتی مضامین کے مطالعے سے فوری طور پر میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارا ادب بالعموم منفی ہے۔ اس میں حقیقت پسندی پر منفی کردار پیش کیے جاتے ہیں۔ معاشرے میں جو فریب کاری، منافقت، خوشامد، حرص و ہوس، خودغرضی، کاہلی اور اس قبیل کی دوسری خرابیاں راہ پا گئی ہیں، ان کی تصویر کشی خوب کھل کر کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کی تحریروں میں سرتاسر مثبت انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ان کے کردار خیر مجسم ہیں اور اگر ان میں شر موجود ہے تو ان کے باطن میں سویا ہوا خیر کسی نہ کسی مہیج سے بیدار ہوتا ہے اور بالآخر وہ بھی خیر، بھلائی اور نیکی کے کام کر گزرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جو مثبت اقدار کو اُجاگر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی تاریخ سے بھی مدد لیتے ہیں اور اپنے عہد سے بھی ایسی کہانیاں چُن لیتے ہیں جو معاشرے کا اچھا روپ دکھاتی ہیں۔ اسلامی اقدار کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی اقدار کے بھی مبلغ ہیں جو بعض اوقات اسلامی سے زیادہ رواجی ہیں۔ وہ ان مشرقی اقدار کی بھی شد و مد سے حمایت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کی یہ تحریریں ہمارے موجودہ معاشرے کی اصلاح کے لیے یقیناً بہت مفید ثابت ہوں گی۔ یہ تحریریں خشک اور خنک نہیں ہیں۔ ان میں ایک ادبی چاشنی ہے جو مصنف کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کے مطالعے سے بعض افراد کے سوئے ہوئے ضمیر ان شاء اللہ بیدار ہوں گے۔

نوید شہزاد/لاہور

## یوگ

"اکھاں دیاں گنڈھاں کھلن والیاں نیں
آ جالگن مٹی کھیڈیے
پر ایہ پہلاں پکی کر لے
جیہڑے سر دی واری آئی
اُس واری نہیں دینی
جت دوہاں دی سانجھی
آ لے میرے سر دا جیہڑا وال
سچے ڈولے اُتے بنھ لے
فٹ جاوے تے گنڈھ نہ دیویں
گنڈھ وچ گنڈھاں آ وسدیاں نیں"
اوہنے ساریاں کھلے منہ نال سنیاں
تے اکھاں بند کر کے
لہندے ول منہ پھیر لیا
پر میں قطبوں پھر نہ سکیا
تے نہ ای چڑھدے ول سینہ کر سکیا
کئی واری تے انج لگدا اے
جیویں، ہن
میں وی اوہدے ورگا ای ہو گیاں
جیہدے ورگا ہور نہیں لبھدا

## سدھراں دی اُوپری منزل

میں ستاں دریاواں دا رج
اپنے ڈھڈ تے بنھ کے
اٹھویں دریا ول نسیا، تے
میرے ہتھیاں دیاں تلیاں نے
لہو دیاں سیلاں لادتیاں
اگلی واری میری سی
میں پچھلیاں تناں پڑھیاں توں
دن دے بوہے تے کھڑا ساں
میری واری آئی تے دن ڈُب گیا
میتوں ہلدے بجھدے تاریاں ول جانا پیا
میں چاہندا ساں
ہاں میں چاہندا ساں
کوئی بجھدا ہویا تارا میتوں
بُرکی بُرکی کر کے کھا لوے
پر توں میتوں اپنی چپّی وچوں لاہیا ای نہ

## باسی اُڈیاں اُتے بجرے نقشے

لہو نال بجھیاں ہوئیاں کنڈیالیاں سرحداں
سرحداں اندر وڈیاں دستیاں
وڈیاں دستیاں وچ نکی دستوں
وڈیاں دستیاں اندر وڈے جنور
نکیاں نکیاں دستیاں اندر نکے جنور
تے کجھ پہرے داراں ورگے قیدی
جیہناں دے قبضے وچ ایہ بجرے نقشے
جیہڑے ویکھیاں ڈھیر بڈھڑے
جیہناں نوں
نویاں لوکاں دی نسبت نے گھبرو کر دتا
تے ہن
تنجر ور گیاں ایہ سرحداں
ماسوں رت وچ لبھن گیاں
رنڈی اکھ دے سفنے وانگر
سدا سہاگن رہن گیاں

## اج وچ کل

ہر موسم دی اکھ وچ جد میں
رڑکن لگ پیا، تے فر
میری چھتا ٹنگ جاوے گی
اُس ویلے وی توں نہ آویں
تیرے آیاں چانن کھنڈ جانا اے
تے فر
میری دھرتے پنگر پیا شیشہ دا منہ
ہالے میریاں تلیاں اُتے
سرہیوں وی نہیں جمی
توں کجھ ہنجوآں دے پندھ تے رُک جا
فر میں تینوں دے دیواں گا
جھلی جوگی تھاں
اندر، باہر
یا فر جتھے توں آکھیں گا
تیری وی تے منگی اے نا
کیوں جے ہالی فرا کواری
تینوں سُفنا متھنا اے میں

# خاقان حیدر غازی/لاہور

## متراِ.....وے!

میرے جگرا پڑیا
توں ہوند ہوند نوں چکھ کے
چُنی دے وچ صدیاں تھمیاں
انبر پیریں رکھ کے
سوچ دی گمر وچوں اُڈیا
گز ریاں ہو یا پل
ہورسے دی اکھ چوں نڑھیا
ہورسے دا جل
بُلھیاں اُتے چنتر چکے
ساہیں گھول کے تھل
روح والا دھامول نہ دے
ایس سے دی گل
چن دا چانن داج نہ دیوے
تارے میٹن اکھ
دل دے وچ بھیوں کے اتھرو
اکھیاں اُتے رکھ

## اگم اتھاہ

سُرت چڑھی،
اگیان دی سولی
رات نہ میٹی اکھ
نین پرین سبھے گن وٹی
چنتر نوں بتھلان
چیت پئے
درہیاں دے چنتر
سُو کا لبھا چھان
سارے گیڑ دے ساہ گیانی
چھان نوں کرک کھان
جیوڑا جیوڑا پا نورا
بھوروتے اک ساہ
اک جیوڑا سُو کا کھاوے
دوجا اگم اتھاہ

## چت

سیس نوا یئے پیراں توڑیں
بھید نہ پایئے کت
پیڑ اپیڑا، پھڑ پھڑ ناپی
جند وچ جند اک ہت
جند بھرے ہو وا ناوانا
ساہ دی اپنی جت
اِکو سورج اُچے روشیں
کیکن اُچے ہت
راز حرف دا کیکن پایئے
پاوے اوڑک چت

## ہوند

ست ست نظراں جتھیں پھڑ کے
دل لئی دید بنائی
ست انبراں جیہی ساہ دی گھاٹی
ست ست بیر چڑھائی
پیراں ہیٹ سے دی مینڈھی
تے دھرت توائی
ست جگاں تک اکو پیڑا
پیڑا ہے لوکائی
ست جگاں دے انبر تھلے
لبھے اپنی شاہی

## میرا دل نہیں بھردا

کِکے موٹے چانن دے نال
میرا دل نہیں بھردا
پورے چیت چ ساوی گھول کے
دریاواں وچ چاند ڈولھ کے
کلا جاواں تردا
کِکے موٹے چانن دے نال
میرا دل نہیں بھردا

انبراں دے نال کھیڈ رچا کے
ساہ توں ساہ دی گل لکا کے
چار دشا دا چانن چکھاں
اج میرا دل کردا
کِکے موٹے چانن دے نال
میرا دل نہیں بھردا
بدلاں دی ٹنگل چوں جھک کے
سورج کولوں لنگھاں لُک کے
تاریاں اُتوں بدل لاہ کے
گلاں جاواں کردا
کِکے موٹے چانن دے نال
میرا دل نہیں بھردا

# نامہ ہائے احباب

السلام علیکم۔ نفسا نفسی کے اس دور میں نرمی اور ملائمت سے بھرپور لہجے میں جب آپ سے فون پر بات ہوتی ہے تو آپ کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کا شعر یاد آتا ہے:

صرف اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حُسن ترے حُسن بیاں تک دیکھوں

غم ہائے روزگار میرے اور آپ کے ملن میں سدِ راہ ہیں۔ ایسی عدیم الفرصتی ہے کہ لاہور جانا مشکل ہے۔ کچھ غزلیں نظمیں نظمانے اور پروین شاکر پر ایک تحریر حاضرِ خدمت ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

خیر سگال

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار

---

قابلِ صد احترام حسن بھائی!

السلام علیکم۔ مزاج شریف! لاہور آنا ہوا ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ بھی اسلام آباد چلے گئے مجھے بھی اسلام آباد کی ایک تقریب میں ایوارڈ دیا گیا۔ نعت اور غزلیں ارسالِ خدمت ہیں۔ اُمید ہے ارژنگ میں شامل فرمائیں گے۔

اوکاڑوی صاحب اور دیگر احباب کو سلام

والسلام

ریاض ندیم نیازی

---

محترم جناب ناز اوکاڑوی صاحب

السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ماہنامہ "ارژنگ" کا شمارہ مئی ۲۰۱۳ء موصول ہوا۔ چند سال قبل بھی یہ محترمہ صغریٰ صدف کے حوالے سے مجھ تک آیا کرتا تھا۔ ماشاءاللہ اس کا معیار اب پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے۔ آج کے دور میں ادبی پرچہ شائع کرنا "جوئے شیر" لانے کے مترادف ہے۔ چند غزلیات اور مختصر تعارف ارسالِ خدمت ہے۔ اسے خصوصی گوشہ کی شکل شائع کریں تو نوازش ہو گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ رابطہ رہے گا۔ دوستوں کو سلام

آپ کا بھائی

ڈاکٹر ثاقب آکاش

---

حسن عباسی! جیتے رہیے!

ارژنگ مسلسل مل رہا ہے، شکر گزار ہوں۔ اس مرتبہ گرمی کی دوپہروں سے کچھ اچھے لمحے اُدھار لیے تو ارژنگ کا تفصیلی اور یک مشت مطالعہ ہو گیا اور مزید اچھا یہ ہوا کہ شام سے بھی کچھ لمحے چُرا لیے اور سوچا کہ لگے ہاتھ خط بھی لکھ ڈالوں تا کہ ہمیشہ کی طرح رسید غتک نہ جائے۔ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ عامر بن علی اور صغریٰ کی ڈاکٹر والیا سناپاگوئی کی جس گفتگو کا اعلان پہلے صفحے پر ہوا ہے وہ کئی مرتبہ پورے رسالے میں ڈھونڈی، کبھی اپنی بینائی پر شک کیا تو کبھی دانائی پر۔۔۔ اس طرح رسالے کے کونے کھدرے تک کھنگالے گئے، چھوٹی چھوٹی خبریں، تقریبات کے احوال، تعزیت نامے ۔۔۔ یہاں تک کہ اشتہار بھی۔۔۔ اچھا لگا۔

تو پھر یہ بھی بتا دوں کہ نیلم کے افسانے نے ہلکا پھلکا ہونے کے باوجود مزہ دیا۔۔۔ اور خیر اتنا ہلکا پھلکا بھی نہیں۔ ہمارے نیم مذہبی اور نیم مغربی معاشرے کی فرسٹیڈ عورتوں کی اچھی تصویر کشی ہے کہ جو مجبوری کی شادیوں کے بعد زندگی کے کونوں کھدروں سے ڈر ڈر کر سانس کر لیتی ہیں۔ سلطان سکون اور دلاور علی آزر کی غزلیں بہت خوب صورت ہیں، تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح نہال کر دیا۔ حمیرا راحت کی نعت اچھی لگی۔ کچھ شاعری پی آر کے سٹینڈر سے بھی کم تھی پر خیر بُری شاعری نہ ہو تو اچھی کی پہچان مشکل ہو جائے۔

دُعائیں

شہ طراز

---

جناب محترم مدیرِ اعلیٰ عامر بن علی صاحب

السلام علیکم کے بعد عرض خدمت ہے کہ آپ کا انٹرنیٹ پر میگزین نظر سے گزرا۔ آپ اپنا میگزین اعزازی طور پر جاری کر دیں یا نمونہ کا ایک پرچہ جاری کر دیں۔ جگر بک کلب کا مقصد ہے کہ اہلِ علاقہ کو دیگر علاقوں سے شائع ہونے والے رسائل اور لٹریچر سے روشناس کرایا جائے اور فروغِ مطالعہ کے لیے آنے والے لٹریچر، لائبریریوں، سکولوں، سرکاری اداروں یا نیم سرکاری اداروں کو مفت تقسیم کیا جائے۔ اُمید ہے کہ آپ تعاون کریں گے اور لٹریچر روانہ کریں گے۔ تمام کارکنان اور اہلِ حباب کو السلام علیکم قبول ہو۔

والسلام

سعید جگر/ کالا گوجراں

---

محترم حسن عباسی صاحب

السلام علیکم! اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ کا ارسال کردہ "ارژنگ" ملا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں کچھ دیر ہوئی جس کے لیے معذرت۔ چند غزلیں ارسالِ خدمت ہیں۔

والسلام

عمر شاہد تگ/ خانیوال

# نستعلیق مطبوعات کی نئی کتابیں

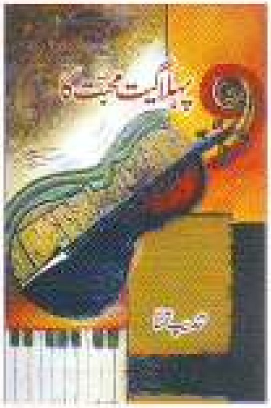

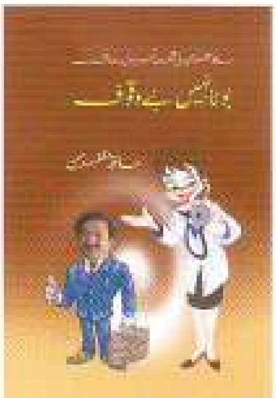
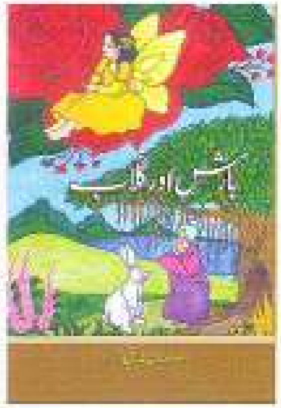

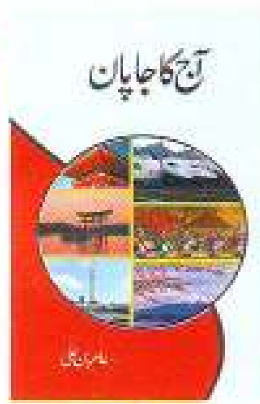

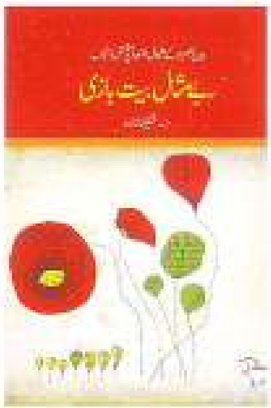
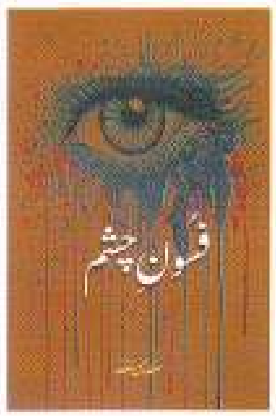

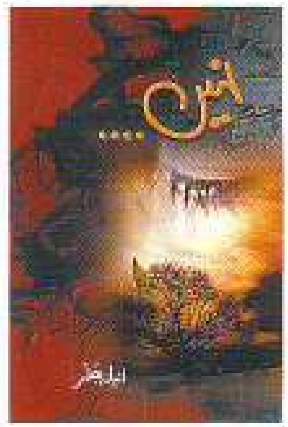

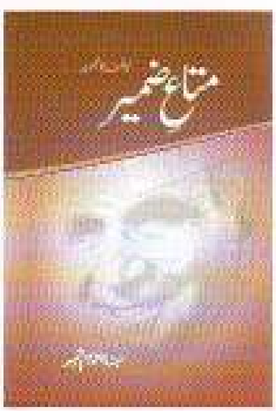

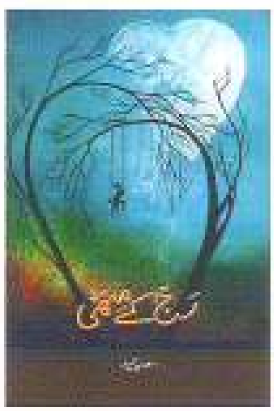
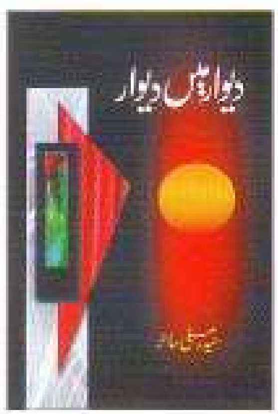

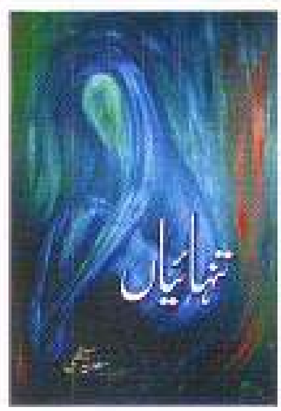


اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق
Publications

غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور۔
nastalique786@gmail.com
03004489310 - 04237351963

ادبی تنظیم سخن کدہ اور روش انٹر نیشنل کے زیر اہتمام

## عامر بن علی کے اعزاز میں محفلِ مشاعرہ

جاوید شیدا، نعیم احمد بشیر، افضال فردوس، عامر بن علی، سحر ش خان، جاوید غنی، رخسانہ نور، حمیدہ شاہین

زوحیر لطیف، افضال فردوس، عامر بن علی، نیلما ناہید درانی، نعیم احمد بشیر، عائشہ اسلم

عمران شناور، وسیم عباس، حسن بانو، حسن عباسی، ابرار ندیم، راجا نیر، ملک سلیم اختر، عامر بن علی، علی اصغر عباس، ڈاکٹر ضیاء الحسن

تقریب میں شریک شعرائے کرام

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com

نستعلیق